منصب رسالت

تلخیص

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جلد پنجم

از

پروفیسر محبوب الٰہی پرنسپل جامعہ شرقیہ لاہور

و

آقا بیدار بخت ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل

پرنسپل دار العلوم السنہ شرقیہ لاہور

ناشر

ملک نذیر احمد پروپرائٹر۔ تاج بکڈپو۔ اردو بازار لاہور

قیمت -/8/2

ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بک ڈپو لاہور نے

نے

انشا پریس لاہور میں باہتمام ملک مبارک علی چھپوا کر شائع کیا

فہرست مضامین

عمل صالح یعنی نیک کام

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دنیا کے لیے لیکر آئے اس میں انسان کی ابدی نجات کو دو چیزوں پر موقوف رکھا گیا ہے، ایمان اور عمل صالح اگرچہ عوام میں جو اہمیت ایمان کو حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں دی جاتی حالانکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ کو مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسلام کی عمارت کا صحیح طور سے کھڑا ہونا بغیر ایمان اور عمل صالح کے ممکن نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ایمان اس عمارت کی بنیاد ہے تو عمل صالح ستون چنانچہ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کو انسان کی فلاح وکامیابی کو منحصر کیا گیا ہے سورۃ العصر میں ہے۔

"بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔"

سورۃ التین میں فطرت انسانی کی درست تخلیق کے بعد پستی میں گر جانے والوں میں سے انہی کو مستثنیٰ کیا جو ایمان اور عمل صالح کے حامل ہیں فرمایا۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر و ثواب ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے کہ یہود اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکہ دار سمجھتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دعویٰ غلط بلکہ :-

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ ۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر موقوف ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت میں صاف فرمایا کہ خواہ مسلمان ہوں یا یہودی و نصرانی اور ستارہ پرست ہوں انہیں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا، اور نیک کام کرے گا وہ خوف و غم سے مبرّا ہے۔ یعنی فلاح و نجات کسی نسل یا مذہب و ملت کی رسمی نسبت پر موقوف نہیں، بلکہ احکام خداوندی پر یقین کامل اور اسکے مطابق عمل کرنے پر ہے۔

غرض ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری ہے۔ اور عدم ایمان اور بدکاری کا ثمر دنیا و آخرت کی تباہی چنانچہ فرمایا۔

" (ذو القرنین نے) کہا کہ جو کوئی گناہ (ظلم) کرے گا۔ ہم اُسے (دُنیا میں بھی) سزا دیں گے۔ پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹایا جائیگا

تو وہ اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک کام کیے تو اس کے لیے بدلہ کے طور پر بھلائی ہے۔"

جنت کے مستحق دراصل وہی لوگ ہیں جو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہیں، فرمایا۔

"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے واسطے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں۔"

ایمان اور عمل صالح ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں

یہ فرض کر لینا کہ عمل نیک کے بغیر بھی ایمان درست رہتا ہے صحیح نہیں۔ بلکہ جسقدر عمل میں قصور ہوگا اُسی قدر ایمان میں بھی کمی ہوگی۔ کیونکہ کسی چیز کے یقین کامل کے بعد اس کے مطابق عمل میں کوتاہی کرنا انسان کی فطرت کے خلاف ہے، اسی طرح تنہا نیک عمل، خدا کے احکام پر یقین حاصل کیے بغیر ناقص اور بے مصرف ہیں۔ اسی لیے قرآن نے الگ الگ نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح دونوں کو ملا کر نجات و فلاح کا ذریعہ قرار دیا ہے جیسا کہ گذشتہ آیات سے بخوبی واضح ہو گیا۔

ایمان اور عمل صالح کی بنا پر مسلمانوں سے خدا نے دنیادی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے ارشاد ہے۔

"(مسلمانو!) تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔"

اُخروی مغفرت اور اجر کا وعدہ بھی انہی سے کیا گیا فرمایا۔

"اللہ نے ان (مسلمانوں) میں سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، بخشش اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے"۔

بعض آیتوں میں ایمان کو اسلام یعنی اطاعت شعاری اور عمل صالح کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے جنت کی ٹھیکہ داری کے دعویٰ کی تردید میں فرمایا۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

کیوں نہیں جس نے اپنے کو خدا کے تابع کر دیا اور وہ نیک کام کرنے والا (بھی) تو اس کا اجر اسکے رب کے پاس ہے نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ایمان و عمل صالح اور دیگر مذاہب

قرآنی ان شواہد سے ظاہر ہے۔ کہ اسلام میں نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں، بلکہ ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے اور یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے، جو اسلام کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلام سے پیشتر ہر مذہب اس سلسلہ میں افراط و تفریط میں مبتلا تھا۔ عیسائیوں میں صرف ایمان پر مدار نجات ہے، بودھ مت میں ہیں صرف نیک عمل استحقاق جنت کے لیے کافی ہے، بعض مذاہب میں صرف گیان اور دھیان کو وسیلہ نجات قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ اسلام ہی ہے جس نے اس میں اعتدال قائم کیا، اور ایمان یعنی ذہنی یقین اور بدنی اور مالی عمل نیک ہیں دونوں کو باہم کر کے

فوز و فلاح کا موجب ٹھہرایا۔ خدا کا ارشاد ہے۔

"وہ ایمان والے فوز و فلاح کو پہونچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو نکمی باتوں کا رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں .... جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا لحاظ پاس کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں۔ یہی (در حقیقت) جنت کے وارث ہیں"

اعمال صالحہ کی قسمیں عمل صالح کا لفظ اگرچہ انسانی اعمال کی بیشمار جزئیات پر حاوی ہے مگر اس کی موٹی موٹی قسمیں تین قرار دی جاسکتی ہیں۔ عبادات [1]، اخلاق [2] اور معاملات [3]۔

اسلام میں عبادت کا دائرہ اسقدر وسیع ہے کہ اس میں ہر وہ کام شامل ہے جس سے خوشنودی خدا مطلوب ہو، اس اعتبار سے اخلاق و معاملات بھی عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مگر اصطلاحی اعتبار سے ہمارے فقہا نے تینوں کے لیے الگ الگ ابواب قائم کیے ہیں۔ جن کی صورت تقسیم یوں ہے کہ عمل صالح کا تعلق اگر براہِ راست خدا سے ہے تو عبادت کہلائے گا اور اگر بندوں سے ہے تو پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو صرف انسانی فرض کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا وہ جس میں قانونی حیثیت بھی ملحوظ ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے،

اس تالیف کا موضوع عبادات اور اس کے متعلقات ہیں جن سے صفحات آئندہ میں بحث کی جاتی ہے۔

عبادات

خدا کا ارشاد ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُمْ ۔ اے لوگوں اپنے رب کی عبادت کرو۔

عبادت کا مفہوم | عام طور سے خدا کی عظمت کے پیش نظر مخصوص ڈھنگ سے چند اعمال کے بجالانے کو عبادت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پیغمبرؐ اسلام نے اللہ کی طرف سے اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے مخصوص طریقوں کے بجائے چند دوسرے مخصوص اختیار کر لینے کا نام عبادت نہیں بلکہ غرض و غایت اور حقیقت سمجھ کر جو طریق اس حقیقت اور غایت کو پورا کرتا ہو وہ عبادت ہے اور عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خدائے واحد کے سامنے اپنے انتہائی عجز و ذلت کا اظہار کریں اور غایت یہ ہے کہ عبادت کا مقصد خدا کی عظمت کا اظہار اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اسلام نے اس کے ساتھ ہی عبادت کے گذشتہ ناقص طریقوں کی اصلاح اور غیر واضح چیزوں کی وضاحت بھی کر دی ہے

عبادت اور زمانہ قبل از اسلام | اسلام سے پہلے عرب عبادت کی صحیح حقیقت اور اس کے صحیح طریقوں سے نابلد تھے۔ یہود

اور عیسائی دو مذہبی گروہ تھے، عیسائیوں کا عقائد کے سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ حضرت عیسٰی کی الوہیت کا عقیدہ تھا اور عبادات کے سلسلہ میں دنیا سے بے تعلق ہو کر کسی پہاڑ یا جنگل میں خانقاہ بنا لینا، تمدنی دنیا سے الگ ہو جانا اور مجرّدانہ اور راہبانہ زندگی بسر کرنا تھا۔ دوسری طرف حضرت عیسٰی، مریم، اولیا اور شہیدوں کے مجسموں اور قبروں کو پوجتے تھے دوسرا گروہ یہود اپنی بداعمالیوں کے باعث بدنام اور خلوص، ایثار اور خدا پرستی سے یکسر بے بہرہ تھا۔ صرف سبت (ہفتہ) کے دن تعطیل منا لینا ہی ان کی سب سے بڑی عبادت تھی۔ علاوہ ازیں یہود جادو، ٹوٹکا اور عملیات کے توہم میں بھی مبتلا تھے، موقع پر بتوں تک کے آگے سر جھکا لیتے تھے۔

قرآن نے دونوں گروہوں کو فاسق قرار دیا ہے، البتہ دونوں کے فسق کی وجہ مختلف ہے۔ عیسائی فرقہ کے فسق کی وجہ اُن کا دین میں زیادتی اور غلو کرنا ہے اور یہودیوں کے فسق کی وجہ ان کا دین میں کمی اور سستی کرنا ہے۔

عیسائیوں کا غلو عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے اسی لیے قرآن نے ان کو کہا۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ — اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ وہ حضرت عیسٰی کو رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا ماننے لگے تھے۔

یہود کی کوتاہی یہود نے نبیوں کو ماننے کے بجائے قتل کرنا شروع کر دیا تھا قرآن میں ہے۔

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ اور وُہ پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں بتوں اور شیطان کی پرستش شروع کر دی تھی، خود توراۃ میں ان کی بت پرستی کا بار بار ذکر آیا ہے قرآن نے ان کے متعلق کہا۔

وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ اور جنھوں نے شیطان کو پُوجا۔

اسلامی احتیاط بعض ازواج مطہرات نے عیسائیوں کے پرستش گاہوں میں تصویر عیسیٰؑ و مریمؑ رکھنے اور اولیا و انبیا کی قبروں کے احترام کا حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں حضورؐ کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے تعریفی رنگ میں بیان کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔

"خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا، تم ایسا نہ کرنا، اُن میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس کی تصویریں اس میں کھڑی کر لیتے تھے"۔

گبن کی شہادت یورپ کا مشہور مورخ گبن نے تاریخ ترقی وزوال روم کی تیسری اور پانچویں جلدیں۔ حضرت عیسیٰؑ و مریمؑ، سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کا حال بالکل قرآن کے بیان کے مطابق نقل کیا ہے جس کی مثالیں روم کے تاریخی گرجاؤں میں اب تک موجود ہیں۔

عرب کی حالت یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود عرب بتوں کی پرستش میں مبتلا تھے ہر ہر قبیلہ کا بُت جُدا تھا، صحیح عبادت خدا کے مفہوم سے عرب ناواقف تھے، بتوں پر جانوروں حتیٰ کہ اولاد کی قربانی کیا کرتے تھے۔ خود خانۂ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں کا مرکز تھا، سیٹیاں اور تالیاں بجا کر بتوں کو خوش کرنے کا طریقہ ان کی نماز سمجھی جاتی تھی، اُس زمانہ کے بعض موحد بھی عبادت کے طریق سے ناآشنا ہونے کے معترف تھے۔ چنانچہ قریش کا موحد زید بن عمر کہتا ہے "اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھے کس طرح پوجوں اگر جانتا تو اُسی طرح عبادت کرتا"۔

دیگر ممالک کا حال اہل یونان اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش ہو رہی تھی، ہندوستان سے لیکر کابل ترکستان، چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتیوں، سمادھوں اور اُن کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی۔ خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، چندر دیوتا گنگا مائی اور اوتاروں کی پرستش کی جاتی تھی۔ عراق میں صابی سبع سیارہ (سات گردش کرنے والے ستاروں) کی پرستش میں مبتلا تھے۔ ایسے وقت میں عرب کے گوشہ سے یہ صدا بلند ہوئی:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ	لوگو! اپنے پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

اہل کتاب کو یوں للکارا:۔

"اے کتاب والو! آؤ ہم تم اُس بات پر (عملاً) متحد ہو جائیں جن میں ہم تم (عقیدۃً) متفق ہیں کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں"۔

اس آواز پر چند حق پرستوں کی طرف سے لبیک کی صدا بلند ہوئی جنھوں نے پکار کر کہا۔

"خداوندا! ہم نے ایمان کے منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ تو ہم ایمان لے آئے پس اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر"

خدائے واحد کی پرستش نبوت محمدی کا پہلا اور سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے دنیا کے عبادت خانوں سے باطل معبودوں کو نکال پھینکا۔ اور صرف ایک خدا کے سامنے تمام مخلوق کی گردنیں جھکا دیں، چنانچہ صاف اعلان کر دیا۔

"آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اُس مہربان خدا کے سامنے غلام بن کر آنے والی ہیں"۔

یعنی آسمان و زمین میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی مستحق ہو کہ اُس کے آگے انسان سر جھکائے بلکہ وہ سب خدا کے آگے سرنگوں ہیں، اور ہر عبادت و پرستش کا صرف وہی تنہا مستحق ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کا اعلان کیا۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ — بے شک میری نماز، میری قربانی، میری

وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ زندگی اور میری موت سب اُسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لیے ہے

کفار کو بتوں کی پرستش سے روکا گیا وہ نہ مانے تو اسلام کے پیغمبر کو اُن سے بے تعلقی کے اعلان کر دینے کا حکم ہُوا، فرمایا۔

"(اے پیغمبر!) کہدو کہ اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہوں اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو جسے میں پوجتا ہوں (مکرر کہا) اور نہ میں اُس کو پوجنے والا ہوں، جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو جسے میں پوجتا ہوں (بس اب ہم تم الگ) تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔"

اسلام کی سادگی عبادت اسلام کی عبادت تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و قیود سے آزاد ہے، صرف پاک لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے نہ سورج اور چاند کے نکلنے کی ضرورت ہے اور نہ دریاؤں کے پانی اُچھالنے کی نہ سامنے آگ جلانے کی حاجت ہے اور نہ دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیوں کے سامنے رکھنے کی نہ موم بتیوں، گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت ہے اور نہ بخورات اور چاندی سونے کے برتنوں کی۔

خدا سے براہ راست تعلق اسلام میں عبادت کا تعلق بندہ اور خدا میں براہ راست ہے اس کے لیے ہندوؤں کی طرح پنڈتوں یہودیوں کی طرح کاہنوں، عیسائیوں کی طرح پادریوں اور پارسیوں کی طرح دستوروں

اور موبدوں کی وساطت کی حاجت نہیں بلکہ بندہ براہِ راست خدا سے عرض حال کرتا ہے اور خدا براہِ راست اس کی سنتا ہے، فرمایا۔

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ تم مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

مکان کی قید نہیں اسلام کے سوا ہر مذہب نے عبادت کو مخصوص عبادت خانوں میں محدود کر رکھا ہے۔ لیکن رسول اللہؐ کی تعلیم کے مطابق زمین کا چپہ چپہ اس قابل ہے کہ وہاں خدا پرستش کی جائے، اس کے لیے مسجد و محراب و منبر اور دیر و حرم کی کوئی قید نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔

وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا اور میرے لیے تمام سطح زمین مسجد بنا دی گئی ہر یعنی بے قید مکان ہر جگہ بارگاہ خدا میں سجدۂ نیاز بجا لایا جاسکتا ہے

عبادت میں جماعتی تنظیم البتہ اسلام نے مسلمانوں میں یک جہتی اور ایک رخ پر مجتمع ہونے کے لیے خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا کیونکہ خانہ کعبہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے، لیکن اس کی وہ حیثیت نہیں جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے۔ اس میں نہ کسی خاص سمت کی تعین ہے اور ستاروں کے رُخ کی جو خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت مشرق، مغرب، جنوب اور شمال ہر سمت کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے، خدانخواستہ اگر کعبہ موجود نہ رہے، تب بھی اس کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے۔ سفر میں نماز نفل کے لیے اجازت ہے کہ جدھر سواری کا رخ ہو اُدھر کو مُنہ

کر کے پڑھ لو، اسی طرح جہاد میں جس طرف رُخ ہو اُسی طرف نماز ادا کر لینے کی اجازت ہے، خود قرآن نے کہہ دیا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ — نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مُنہ مشرق اور مغرب کی طرف کر لو۔

بلکہ :-

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ — تم جدھر بھی رُخ کرو گے اُدھر خدا موجود ہے،

انسانی قربانی کی ممانعت بعض مذاہب میں لوگوں نے اپنے زعم باطل میں خدا کو خوش کرنے کے اپنی اولاد کی بھینٹ چڑھانا بہترین عبادت تصور کر رکھا تھا۔ اسلام نے اس کا قطعی استیصال کر دیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ میں جان دینے کا طریقہ حق کی حمایت، کمزوروں کی مدد، اور باطل کو شکست دینے کے لیے مارا جانا ہے، یہ نہیں خود اپنا گلا کاٹ کر، یا دریا میں ڈوب کر، یا آگ میں جل کر مر جائے، حضورؐ نے فرمایا۔ "جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا، اُس کو دوزخ میں اُسی چیز سے سزا دی جائے گی"۔ یعنی یہ چیز موجب قربت خداوندی و نجات آخروی نہیں ہے۔ بلکہ خدا کے غضب اور عذاب آخرت کا سبب ہے۔

حیوانی قربانی کی اصلاح اسلام سے پہلے عرب میں جانور کی قربانی کا یہ طریقہ تھا کہ اُسے ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے نیز یہ کرتے یہ کہ مردہ کی قبر پر جانور باندھ دیتے اور اُسے بھوکا سُکھا کر مار دیتے تھے،

عرب اپنے عقیدہ میں خون کا نذرانہ خدا کی خوشنودی کا باعث سمجھتے تھے اس لیے قربانی کا خون اپنے عبادت خانوں کی دیواروں پر لتھیڑ دیتے تھے۔

یہود قربانی کو خدا کی غذا سمجھتے تھے اور گوشت کو آگ میں جلا دیتے تھے بعض اہل مذاہب چیل کوّوں کو کھلا دیتے تھے۔

اسلام نے ان سب طریقوں کو مٹا کر بتایا کہ قربانی کا گوشت خدا کی غذا نہیں بلکہ تمھارے دلوں کی غذا یعنی موجب تقویٰ ہے فرمایا۔

"اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا بلکہ تمھارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے"۔

اسلام نے صرف حج کے موقعہ پر قربانی واجب کی ہے اور وہ بھی اس واقعہ کی یادگار کے طور پر جب کہ ملت حنیفی کے پہلے مبلغ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو خواب کی تعبیر کے طور پر قربان کرنا چاہا تھا، اور خدا نے ان کو آزمائش میں پورا اترتا ہوا دیکھ کر دنبہ کی گردن چھری کے نیچے رکھ دی تھی۔

اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قربانی کا مقصد دوسرے مذاہب کی طرح مردوں کی ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا یا صرف خون بہانا اور گردن کاٹنا نہیں ہے۔ بلکہ خدا کا اس احسان پر شکر کہ اُس نے جانوروں کو ہماری ضروریات کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور قربانی کے گوشت سے غریبوں مسکینوں اور فقیروں کی پرورش مقصود ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

"ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ اپنے جانوروں پہ خدا کا نام یاد کریں"

آگے چل کر فرمایا۔

"تو ان میں کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلادو"

اسی لیے خدا کے نام کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبیحہ کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے چنانچہ حرام کی فہرست میں وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو) بھی داخل ہے۔

مشرکانہ قربانی کی ممانعت عرب میں قربانی مختلف طریقہ رائج تھے اونٹنی کے پہلے بچہ کو بتوں کے نام پر ذبح کر کے اس کی کھال درخت پر لٹکا دیا کرتے تھے اور اس کو فرع کہتے ہیں، ماہِ رجب کے پہلے عشرہ میں قربانی کرتے تھے اور اس کو عتیرہ کہتے تھے، اسلام نے ان دونوں کی ممانعت کر دی، حضورؐ نے فرمایا۔

لا فرع ولا عتیرة (اسلام میں) فرع اور عتیرہ (کی قسم کی قربانی) جائز نہیں۔

بتوں کے نام پر زندہ جانور چھوڑ دیتے تھے، قرآن نے اس کی بھی صاف الفاظ میں ممانعت کر دی۔ مردوں کی قبر پر گائے یا بکری ذبح کیا کرتے تھے۔ اس کو بھی اسلام نے ناجائز قرار دیدیا۔ اپنی فیاضی کی نمائش کے لیے دو شخص مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے۔ اور جس کے

اونٹ پہلے ختم ہو جاتے وہی ہار جاتا تھا، اسلام نے اس بیجا مال کے تلف کرنے کو بھی روک دیا۔

دنیوی تعلقات سے کنارہ کشی اور سخت ریاضتیں عبادت نہیں

لوگوں کا عام خیال تھا کہ خدا بندوں کی سخت جانفشانیوں سے خوش ہوتا ہے اس لیے طرح طرح سخت تکلیفیں اُٹھاتے تھے یونانیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا، کوئی چالیس دن تک ترک غذا کرتا کوئی برہنہ رہتا، کوئی برسوں کھڑا یا بیٹھا رہتا اور لیٹنے اور سونے سے بچتا کوئی اپنا ہاتھ کھڑے رکھ کر سکھا لیتا کوئی تاریک غاروں میں چھپا رہتا کوئی زن و فرزند سے قطع تعلق کر کے خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا۔ اسلام نے آکر کہہ دیا کہ یہ سب کچھ نہیں خدا کے دین پر چلنے اور اس سے محبت کرنے کے لیے ان تکالیفِ شاقہ کی ضرورت نہیں خدا بندہ کی قدرت سے زیادہ اس کو تکلیف نہیں دیتا، فرمایا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ — خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف اُٹھانے کا حکم نہیں دیتا۔

اسلام کی سہولت پسندی

اسلام میں روزہ بظاہر غیر معمولی تکلیف معلوم ہوتی ہے اسلام نے اس میں بھی بہت سی آسانیاں پیدا کر کے فرمایا۔

"اللہ تمھارے ساتھ آسانی کرتا ہے سختی نہیں"۔

چنانچہ بیماروں، مسافروں اور روزہ نہ رکھنے کے قابل بوڑھوں وغیرہ کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دے دی۔ حج بھی سب کے لیے مشکل تھا، اس لیے اس کی فرضیت کو زادِ راہ اور چلنے کی استطاعت پر موقوف کر دیا۔

قرآن نے دین کی سہولت کا ان الفاظ میں اعلان کر دیا۔

"(خدا نے) تمھارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی"

حضور نے فرمایا۔

"میں سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں"

اسلام نے عیسائیت کے سخت گیر طریقہ رہبانیت کو بدعت قرار دیا، خدا کی جائز اور حلال کی ہوئی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لینے والوں پر نکیر کی۔

ایک دفعہ خود حضورؐ نے بعض ازواج مطہرات کی رضا جوئی کے لیے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی اس پر وحی الٰہی بلہجۂ عتاب نازل ہوئی فرمایا۔

"اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لیے حلال کیا تو اس کو اپنی بیویوں کی رضا جوئی کے لیے اپنے اوپر کیوں حرام کرتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے"۔

ایک بار چند صحابیوںؓ نے راہبوں کی طرح سخت ریاضتوں کا ارادہ

کیا۔ ان میں سے قدامہ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے آکر حضورؐ سے عرض کی کہ "ہم میں سے ایک نے عمر بھر نکاح نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں" یہ سن کر وہ دونوں اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے جنھوں سے دن بھر روزہ اور رات بھر عبادت کرنے کا دستور بنا لیا تھا، حضور نے فرمایا: "اے عبداللہ تم پر تمھارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے"۔

اسی قسم کی نصیحت حضور نے عثمان بن مظعون کو فرمائی جنھوں نے دن رات روزہ اور نماز کا التزام کر لیا تھا آپ نے انہیں بلا کر فرمایا "کیا تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے ہو" عرض کی "نہیں" فرمایا تو میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں، تمھارے اوپر تمھارے اہل و عیال، مہمان اور خود تمھاری جان کا حق ہے روزہ نماز بھی کرو اور سوؤ بھی"۔

ایک صحابی ایمان لانے سے ایک سال بعد جب پھر حضورؐ کی خدمت حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ پہچان نہ سکے انھوں نے نام بتایا تو حضورؐ نے فرمایا: "تم تو خوبصورت تھے تمھاری صورت کو کیا ہوا" عرض کی میں نے سال بھر مسلسل روزے رکھے، فرمایا تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا۔ رمضان کے علاوہ ہر مہینہ ایک روزہ

رکھ لینا کافی ہے" پھر ان کے اصرار پر ہر مہینہ دو روزہ اور مزید اصرار پر ہر مہینہ تین روزے رکھنے کی اجازت دی۔

چند صحابہ اپنے زعم میں یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہؐ دن رات عبادت کرتے ہوں گے ایک دفعہ حاضر ہوکر ازواج مطہرات سے حضورؐ کی عبادت کا حال دریافت کیا معمولی حال سُن کر کہنے لگے حضورؐ تو معصوم ہیں۔ ہمیں حضور سے کیا نسبت ؛ پھر ایک نے رات بھر نماز کا دوسرے نے عمر بھر روزے رکھنے کا تیسرے ساری عمر نکاح نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، حضور سن رہے تھے۔ تو آپ نے اپنے مذکورہ سابقہ معمولات کا ذکر فرما کر اُن سے کہا "جو میرے طریق پر نہیں چلتا وہ میری جماعت سے نہیں"۔

قدرت وقعت سے زیادہ نماز پڑھنے والوں کو مخاطب کر کے حضور نے فرمایا۔

"اتنے ہی کام کی تکلیف اُٹھاؤ جس کو کر سکو کیونکہ جب تک تم نہ اُکتا جاؤ خدا نہیں اُکتاتا، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہ کام ہے جسکو ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑا ہو"

عرب نے حج کے اندر بہت راہبانہ باتیں داخل کر رکھی تھیں بعض پاپیادہ سفر کرتے، بعض سفر میں مطلق نہ بولتے، بعض دھوپ میں چلتے اور بعض اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے ناک میں نکیل ڈال کر طواف کیا کرتے تھے، اور ان باتوں کی نذر مانتے تھے، لیکن اسلام نے ان سب طریقوں

کو منسوخ کر دیا اور اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر حضورؐ نے فرمایا۔

"اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلی قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی تم کو گرجوں اور دیروں میں ملیں گی"۔

حضورؐ نے تمام راہبانہ غلط طریقوں کا خاتمہ ایک مختصر فقرہ میں کر دیا فرمایا۔

"اسلام میں رہبانیت نہیں"۔

عزلت نشینی عبادت نہیں

دنیا سے تعلق توڑ کر کسی غار یا جنگل میں بیٹھ جانا اسلام کی نظر میں عبادت نہیں، اس کے لیے اللہ اور اسکے بندوں کے حقوق ادا کرنے کا نام عبادت ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں سے تعلق توڑ کر الگ ہو جانے والا اس کی نگاہ میں تعریف کا نہیں بلکہ ملامت کا مستحق ہے۔ وہ دنیا کے کارزار کا نامرد سپاہی ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو سکھاتا ہے کہ مردانہ وار دنیا کے جھمیلوں کو اٹھائیں اور پھر بھی خدا کو نہ بھولیں، غرض اسلام کے نزدیک عبادت ترک فرائض نہیں بلکہ ادائے فرائض کا نام ہے۔

ایک صحابیؓ نے ایک غار خلوت گزینی کے لیے پسند کر کے حضورؐ سے عرض کی کہ میرا جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کروں آپ نے فرمایا۔

"میں یہودیت اور عیسائیت لے کر دُنیا میں نہیں آیا ہوں میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں"

حضورؐ کا اُسوہ بعثت سے پہلے حضورؐ غارِ حرا میں کئی کئی دن یادِ خدا کے لیے رہا کرتے تھے، لیکن جب سے وحی کا پہلا پیغام آیا تو آپ عموماً دعوت و تبلیغ کے لیے جماعت کے ساتھ مِل جُل کر رہتے تھے، دن رات میں صرف چند گھنٹے اور رمضان کے چند آخری دن عزلت و خلوت نشینی میں بسر فرماتے تھے، یہی طرزِ عمل آپ کے خلفا اور عام صحابہ کا رہا ہے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم اسلام میں عبادت کا مفہوم بندہ کا اپنے خالق کے سامنے عجز و انکسار اور فروتنی ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے فرمایا۔

"ہماری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں، کہ جب ان کو ان آیتوں سے خدا کی یاد دلائی جائے تو وہ (فوراً) سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے"

اسی لیے غرور و استکبار کو عبادت کا مقابل اور ضد ٹھہرایا ہے فرمایا۔

"جو لوگ میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہونگے"

قرآن میں متعدد آیتیں اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اور استکبار (اپنے آپ کو برتر سمجھنا) ایک دوسری کی ضد ہیں پس

خدا کے حکم کا مطیع ہو کر اس کے آگے گردن جھکا دینا ہی عبادت ہے اور اس کے لیے خالص اور پاک نیت (قلبی ارادہ) کی ضرورت ہے، یہی نیت عبادت اور غیر عبادت میں وجہ امتیاز ہے، ورنہ اچھے سے اچھا کام جب تک اس سے خدا کی اطاعت کا ارادہ نہ ہو وہ عبادت نہیں کہلا سکتا۔ قرآن نے یہ نکتہ جابجا بیان کیا ہے، فرمایا۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ — اور صرف خدا کی ذات کی طلب کے لیے جو تم خرچ کرو۔

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نکتہ کو نہایت بلیغ اور جامع فقرہ میں ادا فرما دیا۔ ارشاد ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ — اعمال کا ثواب نیّت پر موقوف ہے

نیّت کی اہمیّت

اسی کی مزید تشریح حضورؐ نے مہاجرین مکہ کے سامنے یوں فرمائی، جو گھر بار چھوڑ کر مدینہ آرہے تھے۔

”ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی، اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہونچنا ہے تو اس کی ہجرت خدا کی طرف ہے، اور اگر کسی دنیاوی غرض کے لیے یا کسی عورت کے لیے ہے تو اُس کی ہجرت اسی کی طرف جس کی نیت سے اُس نے ہجرت کی“

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کے اولین شرط دل کی نیت خالص ہے یہ اگر نہیں تو اپنی شہرت کے لیے یا کسی دنیاوی غرض کے لیے اگرچہ

کوئی اپنا سب کچھ لٹا دے تو وہ عبادت نہیں اور خالص خدا کی خوشنودی کے لیے چند کوڑیاں دینا بھی عبادت ہے۔

عبادت کی غرض تعلیم محمدیؐ نے عبادت کی غرض و غایت دل کی پاکیزگی یعنی تقویٰ کو قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن نے عبادت کا حکم دے کر فرمایا۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

پس اسلام کی نظر میں انسان کے وہ سب اعمال و افعال جن سے یہ مقصد حاصل ہو وہ عبادت ہیں۔ عبادت کا دائرہ نماز، روزہ وغیرہ تک ہی محدود نہیں ہر وہ کام جو خدا کی خوشنودی یا کسی مخلوق کی بھلائی کے لیے اپنی نمود و شہرت کی خواہش کے بغیر کیا جائے عبادت میں شامل ہے۔

اس نکتہ کے پیش نظر دین و دنیا کا تفرقہ جو تمام مذاہب نے قائم کر رکھا تھا۔ تعلیم اسلام نے ایک دم مٹا دیا، دوسری مذاہب جن کو دنیوی کام سمجھتے ہیں وہ اگر خدا کی خوشنودی کے لیے کیے جائیں تو اسلام اُن کو بھی دین قرار دیتا ہے چنانچہ پاک روزی کمانا کھانا اور خدا کا شکر بجا لانا بھی عبادت ہے، فرمایا۔

"اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور صاف چیزیں روزی کی ہیں اُن کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو"

کسی غم زدہ کی تشفی کرنا، کسی خطا کار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے
ارشاد ہُوا۔

"اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر جس کے پیچھے ستانا ہو"

حدیث میں ہے کہ "تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر خوشی سے مسکرانا بھی صدقہ ہے۔ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔"
غریب اور بیوہ کی مدد کو بہت سی عبادتوں سے افضل قرار دیا، فرمایا

"بیوہ اور غریب کے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہو اور رات بھر نماز پڑھتا ہو۔"

اسلام کی نظر میں لوگوں میں باہمی عداوت کو دور کر کے محبت قائم کرانا نماز، روزہ سے بھی بڑھ کر عبادت ہے چنانچہ ایک دن حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا "کیا میں تم کو نماز روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں" صحابہ نے عرض کی "یا رسول اللہ ارشاد ہو" فرمایا "آپس کے تعلقات کا درست کرنا"

مخلوق خدا سے نیکی کرنا خدا کو اسقدر پسند ہے کہ حضورؐ نے اس مضمون کو اس پیرایہ میں ذہن نشین کرایا کہ بھوکے کو کھلانا، پیاسے کو پلانا اور بیمار کی عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خود خدا کو کھلانا، پلانا اور اس کی عیادت کرنا، اگر کوئی بندہ، بندہ کے ساتھ یہ نیک

برتاؤ نہ کرے گا تو خدا اس سے انہی الفاظ میں باز پرس کرے گا کہ "میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے نہ کھلایا، میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے نہ پلایا، میں بیمار ہُوا، تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔

غرض محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے ہر کام خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو وہ عبادت اور مستحق اجر و ثواب ہے بیوی کے مُنہ لقمہ دینے، اس کے نفقہ کے ادا کرنے کو حتیٰ کہ جائز طریق سے خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کو بھی حضورؐ نے باعث اجر و ثواب قرار دیا ہے، اس پر جب صحابہ نے سوال کیا "یا رسول اللہ وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے" تو آپ نے فرمایا "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اُس کو گناہ نہ ہوتا پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عبادت کو انسان کے بنائے ہُوئے محدود دائرہ سے نکال کر کسقدر وسیع کر دیا ہے اور اسی وسعت کے پیشِ نظر وحی محمدیؐ کا یہ نظریہ کہ انسان کی پیدائش کی غرض و غایت عبادت ہی ہے واضح ہو جاتا ہے، فرمایا۔

"میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔"

فرض عبادات اور عام غلط فہمی کا ازالہ

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اسلام میں فرض عبادتیں چار ہیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج لیکن ان فرائض

کی تخصیص کی وجہ سے عبادت کے وسیع مفہوم محدود نہ سمجھا جائے درحقیقت یہ چار فریضے عبادت کی لاتعداد جزیات کو ترتیب و نظم میں لانے کے لیے چار مختلف باب ہیں اس لیے ان چار فرضوں کو انسان کے تمام اچھے اور نیک کاموں کے لیے چار اصول تصور کرنا چاہیئے چنانچہ

(۱) نماز اِن تمام اچھے کاموں کا گویا عنوان ہے جن کا تعلق خالق و مخلوق سے ہے۔

(۲) وہ تمام اچھے کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے صدقہ اور زکواۃ کے ماتحت آ گئے ہیں۔

(۳) خدا کی راہ میں جسمانی اور روحانی قربانی اور مادی خواہشات سے پرہیز کے سلسلہ میں جتنے نیک اطوار ہو سکتے ہیں روزہ ان سب کا عنوان ہے۔

(۴) حج، ملت ابراہیمی میں اخوّت کی تنظیم، مرکزی اتحاد کے قیام اور مرکز اسلام کی آبادی اور کسب روزی کا واحد ذریعہ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہُوا کہ یہ چار فریضے اپنے اندر تمام نیک اعمال کو سمیٹے ہُوئے ہیں۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ" اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جن میں سے پہلی چیز عقائد کو اور بقیہ چار ایک مسلمان کے تمام اعمال نیک کو محیط ہیں۔

اس بیان کا مقصد فرائض چہارگانہ کی اہمیت اور مقصود بالذات

ہونکی نفی نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہ عبادات اپنے ماتحت تمام مندرجہ جزیات کے ساتھ فرض ہیں ۔ جو شخص ان جزیات کے بجالانے میں کوتاہی کرے گا اس کی یہ چاروں عبادتیں بھی ناقص اور نامکمل ہونگی۔

اسی نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ شُبہ زائل ہو جاتا ہے کہ اب ہماری نماز برائیوں سے کیوں روکتی ، ہمارے روزے تقویٰ کا موجب کیوں نہیں بنتے ، ہماری زکوٰۃ دلوں کو پاک کیوں نہیں کرتی اور ہمارا حج مغفرتِ گناہ کا باعث کیوں نہیں ہوتا ۔ حالانکہ یہ ان عبادتوں کے لازمی ثمرات و برکات تھے ۔

ہم ان فرائض چہارگانہ کے ادا کرنے کے باوجود دینی و دنیوی وجاہت سے کیوں محروم ہیں حالانکہ خدا کا وعدہ یہ ہے ۔

" اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین خلیفہ بنائے گا ۔

وجہ یہی ہے کہ ان فرائض کے ماتحت جزیات سے غفلت برتنے کی وجہ سے ہماری یہ عبادتیں بھی ناقص ہیں ۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم ان چاروں عبادات کو چھوڑ کر صرف اُن کے ماتحت جزیات پر عامل ہو کر دنیوی بادشاہی کی مالک بن جائے ۔ مگر اس کا آسمان کی بادشاہت یعنی نجاتِ اُخروی میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور اسلام کا مقصد انسان کو دنیوی و اُخروی دونوں قسم کی بادشاہت دلانا ہے اور یہ اُسی وقت پورا ہو سکتا ہے ۔ جبکہ اسلام

کے منشا کے مطابق عبادت کے وسیع مفہوم کو سمجھا جائے اور اس کے مطالبہ کے مطابق اُسی وسعت کے ساتھ اُس کو ادا کیا جائے۔

سوالات

(۱) واضح کرو ایمان اور عمل صالح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

(۲) ایمان اور عمل صالح کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کے نقطہ نظر میں کیا فرق ہے۔ واضح اور مفصل لکھو۔

(۳) عبادت کسے کہتے ہیں؟ اسلام سے پیشتر عبادت کا کیا رنگ تھا۔

(۴) ثابت کرو کہ توحید پرستی نبوت محمدیؐ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

(۵) اسلامی عبادت کی خصوصیات قلمبند کرو۔

(۶) اسلام نے قربانی کے سلسلہ میں کیا کیا اصلاحات کیں۔

(۷) دنیا سے کنارہ کشی کو عبادت تصور کیے جانے میں اسلام اور دیگر مذاہب کے نقطہائے نظر میں کیا فرق ہے۔

(۸) روزہ اور حج جیسی کٹھن عبادتوں میں اسلام نے کیا سہولتیں عطا کیں۔

(۹) اسلام میں عبادات کے ذیل میں نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے

(۱۰) عموماً عبادت نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کو سمجھا جاتا ہے کیا اسلام میں صرف یہی چار عبادتیں ہیں؟

نماز

خدا کا حکم ہے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز کو قائم کرو۔

نماز اسلام کا پہلا رکن ہے جو سب پر یکساں اور ہر حالت میں فرض ہے کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر، اشاروں سے جس طرح بھی ممکن ہو اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔

حقیقتِ نماز نماز اپنے خالق اور اپنے پروردگار کے انعام و احسان کا شکریہ اور اس کے سامنے انتہائی عجز و انکسار کے اظہار کا نام ہے، یہی خالق و مخلوق کے درمیان کا استوار رشتہ ہے اور روح کی تسکین کا ذریعہ غرض زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ نماز ہے۔

ضرورت نماز چونکہ خدا کی یاد اور اس سے دعا و التماس انسان کی فطرت ہے اور انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے اس لئے دنیا کی وحشی سے وحشی قوموں میں بھی خدا کی پرستش کے کچھ نہ کچھ طریقے پائے جاتے ہیں،

پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتا ہے۔
اسلام میں اگر خدا کی یاد کے لیے حمد و تسبیح ہے تو یہودیوں میں مزامیر باجے گاجے) عیسائیوں میں دعائیں، پارسیوں میں زمزمے اور ہندوؤں میں بھجن ہیں۔ پس گویا نماز مذہب کے ان اصولوں میں سے ہے جن پر سب اہل مذاہب متفق ہیں۔ رہے طریق کار تو وہ الگ الگ ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں جو پیغمبر آیا اس نے امت کو نماز کی تعلیم دی اور ملت ابراہیمیؑ میں نماز کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو مکہ میں آباد کرنے کی غرض یہ قرار دی۔

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ — اے پروردگار تاکہ وہ نماز کو قائم کریں۔

نیز یہ دعا کی۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي۔ — اے رب مجھکو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی بابت قرآن کہتا ہے۔

وَكَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ — وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے

حضرت شعیبؑ کو نماز کی ہی تلقین پر انکے ہم قوم نے طعنہ دیا تھا۔

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا — کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے تھے ہم اس کو چھوڑ دیں۔

حضرت لوطؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ
ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز قائم کرنے کی وحی کی۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی "اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر" حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا "میری یاد کے لیے نماز قائم کرو" ان کی امت بنی اسرائیل سے خدا کا وعدہ تھا "اگر تم نے نماز قائم کیے رکھی تو میں تمہارے ساتھ ہوں" حضرت ذکریاؑ کی نسبت فرمایا "وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے" حضرت عیسیٰؑ کا اعتراف ہے "خدا نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے"

قرآن کے علاوہ اُن احادیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کا ذکر موجود ہے۔ جن میں حضورؐ نے بعض امور میں نماز کے اندر یہودیوں اور نصرانیوں کے طرزِ عمل کے خلاف طریقے اختیار کرنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی ہے چنانچہ۔ فرمایا "یہودیوں کی طرح ننگے نماز نہ پڑھو" "نماز میں یہودیوں کی طرح نہ جھومو"

نیز فرمایا "میری امّت میں اس وقت تک دین کا اثر کچھ نہ کچھ رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کرینگے" ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ

یہود و نصاریٰ میں نماز ادا کرتے تھے۔

نماز اور یہود و نصاریٰ

یہود کی اکثریت نماز کو بھلا بیٹھی تھی۔ نماز سے زیادہ ان میں قربانی اور نذرانوں کا رواج ہو گیا تھا اور عیسائیوں نے خدا کے ساتھ بندوں کو بھی پوجنا شروع کر دیا تھا، حضرت عیسیٰؑ و مریمؑ کے علاوہ سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت شروع کر دی تھی جو دو چار موحّد قبل از اسلام موجود تھے، وہ اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے غرض نماز کی موحدانہ حقیقت گم ہو چکی تھی، صورت بالکل مسخ ہو گئی تھی حتیٰ کہ ان کے صحیفوں سے نہ اوقات کا اور نہ نماز کی موثر دعاؤں کا پتہ چلتا ہے۔ سجدہ جو روح نماز ہے اس کو یہود و نصاریٰ دونوں نے چھوڑ دیا تھا۔ قرآن نے اس صورت حال کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے۔ سورۂ مریم تمام انبیائے صادقین کے تذکرے کر کے خدا فرماتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ	ان کے بعد انکے جانشین ایسے ہوئے
خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ	جنھوں نے نماز کو برباد کر دیا اور اپنی
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ۔	خواہشوں کی پیروی کی۔

نماز کے برباد کرنے سے اس کا چھوڑ دینا نہیں بلکہ اس کی حقیقت اور روح کو گم کر دینا مراد ہے، چنانچہ جب مسلمان نماز کے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (نماز کے لیے آؤ) آواز بلند کرتے تھے تو یہود اور نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے قرآن میں ہے۔

"جب تم نماز کے لیے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی بنا لیتے ہیں"

نماز اور اہل عرب

عرب گو نماز کی صورت سے آشنا تھے مگر ادائیگی سے بالکل غافل تھے اس کی جگہ بتوں کی یا جنات اور فرشتوں کی پرستش ان کی عبادت کا خلاصہ تھا حج اور طواف کے موقعہ پر بھی بتوں کو پکارتے اور مشرکانہ حرکات کرتے تھے۔ مسلمانوں کو پڑھتے دیکھ لیتے تو اُن کا مُنہ چڑاتے، دِق کرتے، دھکیل دیتے، شور کرتے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، قرآن نے ان کے متعلق کہا ہے۔

"اور ان کی نماز تو خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے"

دوسری آیت میں ہے۔

"کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے"

یہ ایک بندہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور روکنے والے قریش تھے جو کبھی ہنسی اُڑاتے کبھی دق کرتے، کبھی گلے میں پھندا اور پیٹھ پر نجاست ڈال دیا کرتے تھے یہی نہیں بلکہ مسلمان اگر چھپ کر بھی نماز پڑھتے تھے تو مشرکین پتہ چلتے ہی مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم یہ ملا۔

يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ اے لحاف میں لپٹے ہوئے (پیغمبر) اُٹھو اور ہوشیار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کرو

رب کی بڑائی کا اعلان ہی نماز کی بنیاد ہے جس سے رسول اللہؐ نے خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا، بتوں کو توڑا اور صرف ایک خدا کی عبادت دُنیا میں قائم کی۔ اس طرح آپ نے نماز کی گم شدہ حقیقت کو پھر سے ظاہر فرمایا، بُت پرست عربوں کو آداب نماز سکھائے، عیسائیوں کو ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا اور یہودیوں کو نماز کے خشوع وخضوع اور اخلاص واثر سے باخبر کیا، خدا کے حکم حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ (نماز کی حفاظت کرو) کے ماتحت نماز کی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیت سے نگہداشت کا ڈھنگ سکھایا جس سے مسلمانوں کی پہچان یہ مقرر ہو گئی کہ

"وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں جو اپنی نماز پر پابندی سے قائم ہیں، خود رسول اللہ کو خدا حکم دیتا ہے۔

"اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اسکے پابند رہو"

ادب سے کھڑے ہونے، خشوع وخضوع، تضرع، اخلاص اور بیم وامید کی ملی جلی کیفیت کے پیدا کرنے کو نماز کے لیے ضروری وصف قرار دیا۔

نماز سے متعلق تفصیلی مباحث

(۱) نماز کا مرتبہ | یوں تو ہر آسمانی مذہب نے اپنے اپنے وقت میں نماز پر زور دیا مگر چونکہ وہ خود خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لیے عالمگیر اور دائمی اہمیت قائم نہ کر سکے، اسلام نے جو نماز کی اہمیت، خدا کے سامنے اظہار عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کی جو واضح اور موکد حیثیت ہے وہ کسی مذہب میں نہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیا اور ان کا لایا ہوا پیغام ربانی (قرآن) خاتم الکتب ہے۔

اسلام کی نظر میں نماز وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کسی وقت اور کسی حالت میں مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے سو مرتبہ سے زیادہ نماز کی تاکید کی ہے، اس میں سستی کو نفاق اور عمداً ترک کو نشان کفر قرار دیا ہے، یہی وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل معراج میں ہوئی۔ اسلام میں ایمان کے بعد دوسرا فرض نماز ہے۔ چنانچہ سورۂ روم میں پہلا حکم یہ دیا گیا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا — اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید کی طرف سیدھا رکھ

اسکے بعد متصلاً دوسرا حکم یہ ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ — اور نماز کو قائم رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت سے ایمان و توحید کے بعد نماز کے اولین فرض ہونے

کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک کا اندیشہ ہے
حضورؐ نے فرمایا "نماز دین کا ستون ہے" یعنی جس طرح ستون گر جانے
سے عمارت قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح بغیر نماز کے دین کا قائم رہنا
دشوار ہے۔

طائف کے وفد صلح نے نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا
چاہا آپؐ نماز کے علاوہ دوسری دو باتوں سے مستثنیٰ کر دیا اور فرمایا "جس
دین میں خدا کے سامنے خم ہونا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں"۔

حضورؐ کے آخری لمحات زندگی میں یہ الفاظ زبان پر تھے کہ "نماز
اور غلام" یعنی ان دونوں کی نگہداشت کرو۔

(۲) حقیقتِ نماز صلوٰۃ (نماز) کے لغوی معنی دعا کے ہیں اس لحاظ
سے نماز کی لغوی اور معنوی حقیقت خدا سے
درخواست و التجا ہے، حضورؐ نے فرمایا الدعاء مُخّ العبادۃ
(دعا عبادت کا مغز ہے) نعمانؓ بن بشیر انصاری روایت ہے کہ حضورؐ
نے فرمایا۔ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ (دعا ہی عبادت ہے) اور اسکے
بعد یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ۔

مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل و خوار ہوں گے۔

نماز یادِ خدا کے لیے ہے، حضرت موسیٰ کے قصہ میں فرمایا۔
وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ‏ اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔
اللہ کی یاد ہی انسان کے لیے روحانی اضطراب اور قلبی بے چینی کا علاج ہے، فرمایا۔
اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ ‏ ہاں خدا کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔
اسی مصیبتوں میں صبر و دعا کی تلقین فرمائی۔
وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ‏ صبر اور نماز (دعا) سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔
کائنات کی ہر چیز خدا کی طاعت و تسبیح میں مصروف ہے آسمان، زمین، چاند، تارے، پہاڑ، جنگل، چرند، پرند سب اس کے احکام کے مطابق اپنے اپنے فرائض میں مصروف ہیں، یہی ان کی تسبیح و عبادت ہے، فرمایا۔
"اور دُنیا میں کوئی چیز نہیں مگر اُس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہو البتہ تم لوگ ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔
غور کا مقام ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مصروف تسبیح و عبادت ہے مگر ایک انسان جو عبادت کے لیے ہی پیدا کیا گیا تھا ان میں بہت سے روگرداں ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ مستحق عذاب ٹھہرے۔ انسان معمولی سے ذاتی اختیار و ارادہ کی وجہ سے آمادہ بہ سرکشی ہو گیا۔ اسلام

کی نماز ایسی سرکشی کو دُور کر کے خدا کے آگے جھکاتی ہے۔ کیونکہ جب تمام مخلوق اپنی اپنی طرز میں مشغول تسبیح و تہلیل ہے تو اشرف المخلوق انسان اپنے مقدس خدا کا ترانۂ حمد کیوں نہ گائے؟ یہ ترانۂ حمد ہی نماز ہے۔

(۳) نماز کی غرض و غایت نماز کی غرض و غایت خدائے منعم بر کمال کا ادائے شکر اور دل و زبان کو اس میں مشغول رکھنا ہے تاکہ دل پر اُس کی عظمت اور اپنی بیچارگی کا نقش بیٹھ جائے اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین کامل اس درجہ ہو جائے کہ ہمیں یہ محسوس ہونے لگے کہ خدا ہمارے ہر جسمانی اور قلبی فعل و عمل کو دیکھ رہا ہے تاکہ برائی سے شرمائیں اور اس سے باز آئیں۔

مجمع اصحاب رضؓ میں ایک دفعہ ایک شخص سے حضور علیہ السلام سے نماز کی حقیقت دریافت کی آپ نے تشریح فرمائی پھر پوچھا احسان کیا ہے؟ فرمایا "خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم ان کو دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے"۔

قرآن میں اس نکتہ کی تشریح اس طرح کی گئی۔

"اور نماز کو قائم رکھو، بیشک نماز بُرائی کی باتوں سے روکتی ہے اور یقیناً خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے"

یعنی نماز کی غایت برائیوں سے نجات پا کر ذکرِ الٰہی رگ و پے میں سما جاتا ہے اسی لیے فرمایا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى

کامیاب وہ ہُوا جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا اور نماز پڑھی

یعنی نماز انسان کو اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی اور روحانی مدارج بلند کرتی ہے۔ نماز کے انہی ثمرات کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمثیل کے رنگ میں یوں ذہن نشین کرایا، صحابہؓ سے فرمایا "اگر کسی کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اُس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے"؟ صحابہؓ نے عرض کی "نہیں یا رسول اللہ" ارشاد ہُوا کہ "نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے "جس طرح پانی میل کو" قرآن نے اس کی تصدیق اس آیت سے فرمائی جو ایک صحابیؓ کے گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھنے پر نازل ہُوئی۔

"دن کے دونوں کناروں (صبح و شام) اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں"۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جن جذبات و محرکات کا اپنے پیروؤں میں پیدا کرنا اسلام کا مقصد ہے اس کا اصلی سرچشمہ نماز ہے اسی لیے حضور نے نماز کو عمارت اسلام کا ستون قرار دیا ہے۔

(۴) نماز کے لیے آداب و شرائط کی ضرورت

مادی دنیا کی طرح قلبی اور روحانی دنیا کے لیے کچھ قوانین و آداب ہیں۔ جن کی پابندی سے قلب و روح کے اعمال و افعال کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی (علم نفسیات) نے بھی اب

یہ عقدہ کھول دیا ہے کہ ہر قسم کے جذبات پیدا کرنے کے لیے مناسب شکل و صورت اور ماحول اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انہی اصول پر ہمارے اجتماعی، معاشرتی قوانین کی بنیاد ہے اور اسی اصول کی بنا پر مذہبی اور سیاسی مقاصد کے لیے بھی کچھ قواعد وضوابط مقرر ہیں۔ چنانچہ دوسرے مذہبوں کے معبدوں میں بھی پجاریوں کے لیے خاص لباس، خاص آداب اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں اور شاہانہ رعب قائم کرنے کے لیے درباریوں نوجوں، چوبداروں وغیرہ کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔

پس انہی نفسیاتی اصول کے ماتحت مذہبی اعمال میں بھی کچھ آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے۔ چونکہ نماز کا مقصد خدا کی عظمت اور اپنی بیچارگی کا اظہار کر کے دل کی پاکی اور صفائی حاصل کرنا ہے اس لیے اس کے لیے اسی کے مناسب آداب و شرائط رکھے گئے ہیں۔ تاکہ نیک جذبات کو تحریک اور نشو و نما ہو جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) نماز پڑھنے والا یہ سمجھے کہ باعظمت و جبروت بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے جس کا شریک کوئی نہیں۔ اس لیے ادب سے ہاتھ باندھنا، پرسکون رہنا، نظریں نیچی رکھنا، اس تصور کی تقویت کا باعث ہیں۔

(۲) نماز کی جگہ پاک ہو۔

(۳) بدن پاک ہو۔

(۴) کپڑے پاک ہوں۔

(۵) ادب اور عجز کے ساتھ اپنی التجاؤں کو پیش کیا جائے۔

اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر لازمی طور سے انسان کی باطنی کیفیت پر ہوگا اور اس میں روحانی فیوض و برکات کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

اسی اصول کے ماتحت تنہائی میں فرض نمازوں سے مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا افضل ہے تاکہ جماعتی ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کر دے، کیونکہ نفسیات اجتماع کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ جماعت میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ اور اس طرح سے ایک ہی کیفیت ساری جماعت میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی لیے اسلام نے اپنی عبادت (نماز) میں ان طبعی و نفسیاتی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے اور انہی کا نام آداب و شرائط یا ارکان نماز ہے۔

(۵) ذکر و دعا کے دو طریقے | چونکہ اسلام کے نزدیک عبادت سے غرض خدا کی درگاہ میں خشوع و خضوع اور اپنے گناہوں پر بندہ کا نادم ہونا ہے، اس لیے اس نے اپنی عبادتوں کے دو طریقے رکھے ہیں۔

(۱) ایک وہ طریقہ جس کے لیے قید زمان و مکان کچھ نہیں ہر وقت ہر جگہ اور ہر حالت میں انسان یہ عبادت کر سکتا ہے اس کا نام تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا "تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے

اور لیٹے (غرض ہر حالت میں) یاد کرو"۔ حضورؐ کے فیض صحبت سے صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ خدا نے ان کی یوں مدح فرمائی۔

"جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں" دنیوی مشاغل بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کر سکتے فرمایا" وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے"

(۲) دوسرا طریقہ نماز ہے جو ایک جماعتی متحدہ طریق عبادت ہے اور جس کے لیے خاص شکل و ہیئت، خاص دعاؤں، اور خاص اوقات کی پابندی ہے۔

پہلا طریق انفرادی ہے اس لیے وہ تنہائی کا راز ہے۔ جسے خاموشی سے ادا کرنا چاہیئے۔ تاکہ ریا و نمائش سے پاک رہے لیکن دوسرا طریق درحقیقت عبادت کی اجتماعی شکل ہے اس کے لیے جماعت مشروع کی گئی۔ اور اس کے منکر کا قتل تک جائز قرار دیا گیا ہے، انفرادی طور پر ادا کرنے سے اگرچہ نماز ادا ہو جائے گی، مگر جماعت کے ثواب و برکات سے محرومی رہے گی۔ البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے جماعت میں شریک نہ ہو سکے تو پھر انفرادی طور سے اس کا ادا کرنا لازمی ہے

(۶) نماز اور نظام وحدت

اسلام کا اصلی مطمح نظر توحید ہے۔ یہی اسلام کا اصلی راز بلکہ سر الاسرار ہے اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اسی حقیقت کا مظہر ہے جس کو

نماز کی ہر حرکت و سکون میں جلوہ گر ہونا چاہیے پھر چونکہ نماز ایک اجتماعی فریضہ ہونے کے لحاظ سے خاص شکل و ہیئت اور تعین سمت و وقت کے بغیر متحدہ نظام سے ادا نہ کی جا سکتی تھی اس لئے اسلام نے ان سب باتوں کی تعین کر کے اس کو ایک نظام وحدت کی صورت میں آشکارا کر دیا جو توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے کیونکہ کروڑوں روحوں کو جو کروڑوں متفرق جسموں پائی جاتی ہیں۔ ایک متحد جسم اور واحد قالب میں ڈھالدینا صرف اسی طرح ممکن تھا جیسا کہ انسان کا ہر جماعتی نظام خواہ مجلسی ہو یا عسکری اور دولتی سب اسی اصول پر قائم ہیں۔

(۷) نماز اور جسمانی حرکات یہ انسانی فطرت ہے کہ خاص جذبہ کے طاری ہونے کے وقت اُس سے کوئی خاص فعل اور حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ میں چہرہ کا سرخ ہونا، خوف میں زرد ہو جانا، خوشی میں کھل جانا اور غم میں سکڑ جانا، عاجزی و فروتنی اور خوشامد کے وقت انسان کا منہ کے بل گرنا، قدموں میں سر رکھ دینا اس کی فطرت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے قلبی اعمال کے مظاہر اُس کے جسمانی اعضا ہیں۔ کسی کے قلبی ارادہ و نیت کا اندازہ اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان کی حرکات یعنی (قول و عمل) سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے جس طرح نماز کی دعاؤں کو انسانی طرز بیان میں ادا کیا ہے اسی طرح اس کے ارکان بھی انسان

کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے ہیں۔ اگرچہ خدا کو بندوں کی قلبی کیفیت سے آگاہ ہونے کے لیے اُن کے اعضاء کی حرکات کی حاجت نہیں مگر بندوں کو تو اظہار مدعا کے لئے اس کی ضرورت ہے تاکہ وہ ظاہری اور باطنی دونوں حیثیت سے عرض و التجا کی تصویر بن جائیں۔

پھر چونکہ انسان روح اور جسم دونوں کے لحاظ خدا کی مخلوق ہے اس لیے اس کے احسانات کے شکریہ میں سجدۂ نیاز کے لیے روح اور جسم دونوں ہی کو جھکنا بھی چاہیے، پس سب سے بڑے محسن (خدا) کے سامنے اظہار عجز کے اور اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا (قیام) جھکنا (رکوع) آستانہ پر سر رگڑنا (سجدہ) یہ تین رکن نماز کے ہیں۔

(۸) ارکانِ نماز نماز ملت ابراہیمی کی اہم خصوصیت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے کعبہ کو پاک وصاف کرنے کا حکم دیا تو اس کی غرض بھی ساتھ بتائی فرمایا۔

"اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں (حاجیوں) اور کھڑے ہونے والے، رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے (نمازیوں) کے لیے پاک وصاف کر"

اس آیت میں نماز کے یہی تین رکن قیام[۱] رکوع[۲] اور سجدہ[۳] بترتیب مذکور ہیں۔ اگرچہ تورات کے ترجموں نے حقیقت پہ پردہ ڈال رکھا ہے

مگر پھر بھی توارت کے بعض حوالوں سے نماز کے ان ارکان کا پتہ چلتا ہے، ذیل میں ہر ایک کا حوالہ درج کیا جاتا ہے۔

قیام — "پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا"
(پیدائش ۱۸-۲۲)

رکوع — "اور ابرہام زمین تک اُن کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند" (پیدائش ۱۸-۲)

سجدہ — "اور یہ سُن کے خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور اُن کے دُکھوں پر نظر کی، انھوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کئے"۔ (خروج ۴-۳۱)

زبور میں حضرت داؤد خدا سے کہتے ہیں۔

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کرونگا"۔

انجیلوں میں سے ایک میں ایک موقعہ پر گھٹنے ٹیکنا (یعنی رکوع) کا اور دوسری میں مُنہ کے بل گرنے (یعنی سجدہ) کا ذکر ہے۔

رسول اللہ کے بعثت کے بعد بھی جو یہود و نصاریٰ پابند نماز تھے وہ بھی یہ ارکان ادا کرتے تھے۔ قرآن پاک کی شہادت ہے۔

"اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں"

حدیث میں ہے کہ "رکوع میں یہود کی طرح دونوں ہاتھ جُڑے نہ رہیں" اس سے یہود کی نماز میں رکوع کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

اسلام نے اپنی نماز میں الٰہی ارکان اور فطری شکل وصورت کو قائم رکھا جو عہد ابراہیمؑ سے چلے آرہے تھے، ان میں جو انسانی آمیزشیں ہوگئی تھیں ان کو نکال کر مٹے ہوئے نقوش کو اُبھارا اور نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی اس طرح اُس نے وہ تکمیل کا فرض ادا کیا جس کے لیے وہ ازل سے منتخب ہُوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے کہ نماز کے لیے تسبیح وذکر الٰہی علاوہ اور بھی کچھ ارکان وشرائط ہیں، چنانچہ قرآن نے بھی خوف وجنگ کے مواقع پر تخفیفِ ارکان کی اجازت دی اور امن وسلامتی کے زمانے میں حسب دستور پورے ارکان وشرائط کی ادائیگی کا حکم دیا ہے، فرمایا۔

"نمازوں کی اور بیچ کی نماز (عصر) کی حفاظت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر پڑھو پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اُس نے تم کو بتا دیا جو تم نہیں جانتے تھے"

صلوٰۃ خوف یعنی جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق فرمایا۔

پس جب تم نماز (ایک رکعت) ادا کر لو تو اللہ کو اُٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ ایک رکعت جو امام کے ساتھ باقاعدہ

ہوا کی اسکو ادائے صلوٰۃ کہا گیا۔ دوسری رکعت جو اُٹھتے بیٹھنے اور حملہ و مدافعت کی حالت میں خدا کا نام لیتے ہوئے پوری ہوئی اُس کو صرف "ذکر خدا" کہا، دوسری بات یہ کہ امن و اطمینان کے بعد نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز قائم) کرنے کے لیے ذکر و تسبیح کے علاوہ بھی بعض دوسرے ارکان و شرائط کی ضرورت ہے جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف کر دیے گئے تھے

اب نماز کے ارکان و آداب پر قرآن کی روشنی میں نظر ڈالنا مناسب ہے۔ اگرچہ رسول اللہؐ اور ان کے صحابہؓ کے تواتر عمل نے ان ارکان و آداب کو ہر دوست و دشمن اور موافق و مخالف کے سامنے جلوہ گر کر رکھا ہے تاہم نظریہ کے لوگوں کے لیے قران سے ثبوت دینا مناسب ہے۔

(۱) نماز کے لیے مودّب کھڑے ہونا چاہیے جیسا کہ مسلمان بجا لاتے ہیں، قرآن میں ہے۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ — اور خدا کے آگے ادب سے کھڑے ہو

(۲) نماز کا آغاز خدا کے نام سے ہونا چاہیے، فرمایا

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ — اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار ہوتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے،

(۳) اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا اور طلب مغفرت کرنی چاہیے، فرمایا

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۔ — اور (اے پیغمبر!) جب تم کھڑے ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کرو۔

(۴) پھر کچھ قرآن پڑھنا چاہیے، فرمایا۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ — قران میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

(۵) اس قراۃ قرآن میں خدا کی حمد اور اس کے اسماء و صفات کا ذکر ہوتا ہے۔ جس سے اس کی بڑائی ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا۔

"اے پیغمبر! کہہ دے کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو، جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اُسی کے ہیں اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ اور بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کر اور کہہ حمد اس خدا کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب اس کے لیے کوئی مددگار (درکار) ہے اور اس کی بہت بہت بڑائی بیان کر"

سورۃ فاتحہ چونکہ سراپا حمد و ستائش اور طلب ہدایت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس کو نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا لازمی ٹھہرا دیا گیا۔

(۶) پھر خدا کے آگے ادب سے جھکنا چاہیے یعنی رکوع کرنا چاہیے، فرمایا۔

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ — اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

(۷) پھر خدا کے سامنے سربسجود ہو جانا چاہیے فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ — اے ایمان والو ارکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔

(۸) رکوع اور سجدہ میں خدا کی تسبیح کرنی چاہیے۔ فرمایا۔

(۱) فسبح باسم ربك العظيم — تو اپنے بزرگ پروردگار کے نام کی تسبیح کر

(۲) فسبح باسم ربك الاعلىٰ — تو اپنے برتر پروردگار کے نام کی تسبیح کر

قیام، رکوع اور سجدہ کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے پہلے کھڑے ہونا پھر جھکنا اور پھر سجدے میں گر پڑنا اس میں خود طبعی ترتیب پائی جاتی ہے۔ عموماً تعظیم کی ابتدائی شکل کھڑے ہو جانا، مزید جذبات کی گہرائی پیدا ہو جانے پر جھک جانا اور فرط بیخودی پیدا ہو جانے پر پیشانی کو اپنے محسن کے قدموں پر رکھ دینا، عین فطرت وعقل کے مطابق ہے اسی لیے سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت اور قرب الٰہی کی آخری منزل ہے، فرمایا۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ — اور سجدہ کر اور (خدا سے) قریب ہو جا

اسی لیے سجدہ ہر رکعت میں دو بار کیا جاتا ہے تاکہ دولت قریب سے مزید سرفرازی حاصل ہو۔

(۹) نماز تمام عبادات جسمانی کا مجموعہ ہے

قرآن نے جن جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا ہے۔ مثلاً خشوع و خضوع، سے کھڑے ہونا جھکنا اور سرنگوں ہونا ذکر و دعا، تسبیح و استغفار اور درود و سلام نماز ان سب کا مجموعہ ہے، جس میں یہ تمام منفرد احکام مرتب و منظم طور سے آ گئے ہیں۔

اگر نماز نہ ہوتی تو احکام انسانی کے ذاتی انتخاب منحصر ہوتے، جو چاہتا قیام کرتا، جو چاہتا رکوع کرتا، جو چاہتا صرف زبانی تسبیح و تہلیل پر اکتفا کرتا، اور جو چاہتا صرف دل کی توجہ اور دھیان کو ادائے فرض کے لیے کافی سمجھ لیتا بلکہ ممکن تھا کہ انسان کی طبعی سستی ان پورے احکام کی تعمیل سے روک دیتی پھر عبادت کی اجتماعی شان، اور نظام وحدت قائم نہ رہ سکتا نہ جماعت ہوتی اور نہ نماز شعار اسلام سمجھی جاتی، خدا نے نماز کی اسی اہمیت اور جامع العبادات ہونے کی وجہ سے اپنے خاص فرشتہ جبریل کے ذریعہ رسولؐ کو اور رسولؐ نے امت کو نماز کی عملاً تعلیم دی جو تواتر عمل کے ساتھ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا یوں تو احادیث میں نماز میں پڑھنے کے لیے بہت سی دعائیں مروی ہیں۔ ہر مسلمان اُن میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے مگر نماز کی اصلی دعا سورۂ فاتحہ ہے۔ جس کو ہر رکعت میں پڑھنا واجب قرار دیا گیا ہے اور جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی ہے یہی وہ دعا ہے جس کی خدا نے بندوں کی بولی میں تعلیم دی ہے، اس دعا کی جامعیت اور اہمیت سمجھنے کے لیے اس کے معانی پر غور کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے خدا کی حمد و ستائش ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ — حمد ہو اس خدا کی جو جہانوں کا پروردگار ہے

خدا کی اس صفت سے کہ وہ جہانوں کا پروردگار ہے اُس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں سب سامنے آجاتی ہیں۔ نیز سب جہانوں کے ایک پروردگار ہونے سے کل کائناتِ ہستی کا بلا تفریق ایک رشتۂ برادری ہیں منسلک ہونے کا سمان بندھ جاتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ جو بڑا رحم والا اور نہایت مہربان ہے

ان صفات سے خدا کی بے انتہا رحمت و شفقت، غیر محدود بخشش و عنایت اور اسکے ناقابل بیان کیفِ محبت سے دل معمور ہو جاتے ہیں۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جو عمل کے بدلے کے دن کا مالک ہے،

اس صفت خداوندی کو زبان سے ادا کرتے ہی انسان کو اپنی ذمہ داری، مواخذہ اُخروی اور خدا کے جلال و جبروت کا پورا نقشہ نظر آنے لگتا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس اعتراف و عہد سے ہر قسم کے شرک کی بیخ کنی ہو جاتی ہے اور دُنیا کے سہاروں اور وسیلوں سے بے نیازی حاصل ہوتی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تو ہم کو سیدھے راستہ پر چلا۔

یعنی خدا ہی ہم کو سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا کر سکتا ہے اور یہ صراط مستقیم خدا کی شریعت کے احکام ہیں جن کی تفصیل اِن آیات میں کی گئی ہے، فرمایا۔

"(اے پیغمبر) کہدے آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمھیں اور اُنہیں روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو نہ مارو لیکن انصاف کے ساتھ ...... اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ لیکن اچھی نیت سے یہاں تک کہ وہ اپنی قوت (درجہ بلوغ) کو پہنچ جائے، اور ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، جب تم کوئی بات بولو تو انصاف کرو خواہ وہ (فریق ثانی) رشتہ دار ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ ہیں وہ باتیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور بلاشبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اس کی پیروی کرو۔"

ان آیات میں مذکورہ تمام باتیں جن کا مختصر عنوان الصِّرَاط

الْمُسْتَقِيْمَ ہے اسی کی رہنمائی نمازی خُدا سے چاہتا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ان کا راستہ جن پر تو نے فضل و انعام کیا

خدا کے انعام مستحق بندے وہی ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات موجود ہوں اور یہ صفات اطاعت خدا و رسول سے حاصل ہوتی ہیں، چنانچہ فرمایا۔

"اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر خدا نے فضل و انعام کیا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح بندے، ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے"

یعنی ہر نمازی کو مطلوبہ صراط مستقیم وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین چل چکے ہیں اور جس سے ہٹنا گمراہی اور خدا کے غضب کا موجب ہے، اسی غضب سے نمازی بچنے کی دعا مانگتا ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا

وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، خدا کی شریعت میں اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ افراط ہے اور خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دینا تفریط، اور یہی دونوں باتیں خدا کے غضب اور اس کے فضل و انعام سے محرومی کا موجب ہیں۔

نصاریٰ نے افراط سے کام لے کر دین میں بدعتیں داخل کر لی تھیں اسی لیے مستحق غضب ہوئے اور یہود نے احکام خداوندی کو پس پشت ڈالا اور اسی لیے خدا کے فضل و انعام سے محروم ہوئے، پس مسلمان کی یہ دعا ہے کہ الٰہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہ راہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے سورۂ فاتحہ کا دین و دنیا کی تمام دعاؤں کا جامع اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات پر محیط ہونا واضح ہو جاتا ہے اس لیے آنحضرتؐ نے فرمایا "جو شخص نماز میں اس سورت کو نہ پڑھے اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے"۔

نیز ایک حدیث قدسی میں رسول اللہؐ نے سورہ فاتحہ کا بندہ اور خدا کے درمیان دو حصوں میں منقسم ہونے کا اظہار فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے لیکر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک خدا کی حمد و ستائش اور اس کی عظمت کا بیان ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ خدا اور بندہ میں مشترک ہے۔ اس کے بعد آخر تک بندہ کا خالص حصہ اور اس کی دعا ہے جس کے متعلق خدا کا ارشاد ہے

"اور میرے بندے جو مانگا وہ اس کو ملا"

سورۂ فاتحہ اور اس کے متعلق اس حدیث قدسی کے دلفریب نظارہ نے ایک عیسائی یوروپین فاضل اے جی ونسنک کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز کے

متعلق لکھتا ہے۔

"اسلام کی تعلیمات کی رو سے نماز حضور قلب سے ادا ہونی چاہیے ایک دفعہ محمدؐ نے ایک بُوٹے نقش و نگار کپڑے کو اس لیے اُتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے ...... نماز میں خشوع و خضوع کی ضرورت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں محمدؐ نے کہا ہے کہ "میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے"...... نماز کی اعلیٰ خصوصیت یہ ہے جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ "نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے" اور اس کی تشریح اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔"

سوالات

(۱) نماز کی حقیقت اور اس کی ضرورت میں پر مغز نوٹ لکھو۔

(۲) یہود اور نصاریٰ نے نماز کے ساتھ کیا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔

(۳) اسلام میں نماز کی اہمیت پر روشنی ڈالو۔

(۴) نماز کی غرض و غایت کیا ہے۔

(۵) نماز کے آداب و شرائط اور ان کی حکمتوں کو تفصیل سے حیطہ تحریر میں لاؤ۔

(٦) کیا نماز جماعتی نظام وحدت کی تعلیم دیتی ہے؟

(۷) نماز کے ارکان کیا ہیں۔

(۸) ثابت کرو کہ نماز تمام جسمانی عبادات کا مجموعہ ہے۔

(۹) نماز کی دعاؤں میں سورۂ فاتحہ کا کیا درجہ ہے اس سورۃ کی تشریح مضامین اسطرح کرو اس حدیث قدسی کا مطلب واضح ہو جائے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ "سورۂ فاتحہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے"۔

(۱۰) سورۂ فاتحہ کا دوسرے انبیاء کی دعاؤں سے مقابلہ کرکے اس کی ترجیح کے وجوہ لکھو۔

سورۂ فاتحہ کا دوسرے انبیاؑ کی دعاؤں سے موازنہ

دُنیا میں ہر پیغمبر نے نماز کا حکم اور اسکے لیے دعاؤں کی تعلیم دی ہے توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا موجود ہے۔ زبور تو سراسر دعاؤں کا مجموعہ ہے اس میں ایک دعا کا عنوان "داؤد کی نماز" ہے انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی وداعی شب کی دعا مذکور ہے جو عیسائیوں کی نماز کا اصلی جز ہے ان سب کے مقابلہ میں سورۂ فاتحہ اور اس کی جامعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں وہ کون سا بے نظیر وصف ہے جس کے سبب سے اس کو نماز کی ہر رکعت میں پڑھنے کے لیے منتخب کیا گیا اور جس کی وجہ سے حضورؐ نے حضرت ابیؓ سے فرمایا "کہ نماز میں جو سورۃ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن (سورہ الحمد)۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اُتری، نہ انجیل میں، نہ زبور میں، اور نہ اسکے مثل کوئی دوسری چیز خود قران میں ہے"۔

حضرت موسیٰ کی نماز کی دُعا توراۃ میں ہے کہ طور پر جلوہ ربانی دیکھ کر جب حضرت موسیٰ سجدہ میں گر پڑے تو

خدا نے ان کو یہ دعا سکھائی۔

"خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیما، اور رب الفیض ووفا، ہزار پشتوں کے فضل رکھنے والا، گناہ، تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں نہ بخشے گا بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا"

اس دعا کے ابتدائی فقرے نہایت موثر مگر آخری فقرے نہایت مایوس کن ہیں۔

حضرت داؤد کی نماز کی دُعا

زبور باب ۸۶ میں داؤد کی نماز کے عنوان سے ایک بہت طویل دُعا ہے جو چار پیراگراف میں ہے، پہلے[۱] پیراگراف میں اپنی دین داری، مسکینی اور بندگی کا اظہار کرتے ہُوے خدا سے اپنی پریشانی کے دور کرنے اور رحم فرمانے کی درخواست ہے اور خدا کے اوصاف رحم وکرم کا ذکر بھی ہے۔ دوسرے[۲] پیراگراف میں خدا کی توحید کے بیان کے ساتھ پھر اپنی مصیبت کا اظہار کر کے اس کی رحمت کی درخواست ہے۔ تیسرے[۳] پیراگراف میں راہِ صدق و ہدایت کی طلب، خدا کے خوف وخشیہ اور اس کی رحمت کے بے پایاں ہونے کا مضمون ہے۔ چوتھے[۴] پیراگراف میں اپنے دشمنوں کی تکلیف رسانی اور نظر اندازی کا ذکر کر کے پھر اپنے لئے خصوصی

طور پر رحم وکرم کی درخواست کی گئی ہے۔
اس دعا میں اگرچہ خدا کی حمد، توحید، عبادت، راہ ہدایت کی طلب اور شریروں سے پناہ مانگنے کا مضمون ہے مگر کافی طویل اور تکرار مضامین سے پُر ہے۔ پھر حضرت داؤد کی ذاتی شخصیت کا رنگ اس دعا میں اسقدر غالب ہے کہ وہ عام یعنی ہر شخص کی دُعا نہیں بن سکتی اور طویل ہونے کی وجہ سے اس کا ہر وقت کی نماز اور اس کی ہر رکعت میں پڑھنا تمام نمازیوں کے لیے دقت طلب ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی نماز کی دُعا حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کو نماز کے لیے یہ دُعا سکھاتے ہیں۔

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو تیر بادشاہت آوے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال، بلکہ بُرائی سے بچا کیونکہ قدرت، بادشاہت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے"۔ آمین۔

یہ دعا، دعائے محمدؐی سے بہت مشابہ ہے نام کی تقدیس سے حمد خدا، بادشاہت سے یوم جزا روز کی روٹی سے برنگ استعارہ روحانی غذا یا صراط مستقیم، قرض سے بطور استعارہ

حقوق و فرائض اور آزمائش میں نہ پڑنے سے گمراہ اور مستحق غضب لوگوں کے راستہ سے بچنے کی طرف اشارات نکلتے ہیں مگر استعارات میں ہونے کی وجہ سے ظاہر بینوں کے لیے لغزش عقل و ذہن کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس دعا میں سب سے زیادہ محل نظر یہ امر ہے۔ کہ خدا کو قرض معاف کرنے میں بندوں کے اُسوہ کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ غرض ان چار اولوالعزم پیغمبروں کی دعائیں کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو دین کے مختلف مدارج کمال میں ہوتی ہے۔ دعائے محمدی تکمیلی شکل رکھتی ہے۔ وہ مختصر ہونے کے باوجود تاثیر سے لبریز اور خدا کی صفات کاملہ، شریعت کے تمام احکام و مقاصد کی جامع ہے الفاظ عام ہیں جو ہر انسان کی ہر وقت اور ہر حالت میں نمائندگی کر سکتے ہیں۔ بیان صاف، سادہ اور استعارات سے پاک ہے جس میں ذہنی لغزش کی کوئی گنجائش نہیں۔ خدا کا مکمل تصور ربوبیت، رحمت اور مالکیت سے ہی ہو سکتا ہے یہ سورۃ ان کی جامع ہے ربوبیت اور رحمت خدا کی صفات جمالی کا اور مالکیت اس کی جلالی صفات کا مظہر ہے۔ طرز بیان خدا اور بندہ کی شان کے عین مطابق ہے، خدا کے اوصاف اور بندوں کی درخواست و التجا میں تناسب مقدار ہے یعنی دونوں حصے متوازن ہیں۔ غرض خدا کی عظمت و جلال، رحم و کرم، اور بندہ کے خشوع و

خضوع، بلند حوصلگی اور حق طلبی کا ایسا جامع مرقّع سورہ فاتحہ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اوقاتِ نماز

ضرورت تعین اوقات

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہُوا دین عملی ہے صرف نظری نہیں اس لیے اس نے جو نماز کی تعلیم دی ہے وہ اسی لیے دی ہے کہ انسان مختلف اوقات میں اس فریضہ کو ادا کرے اور یہ چیز انسان کی نفسیاتی ہے کہ بغیر اوقات کی تعین کے وہ مستعدی سے بلاناغہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ اس لیے ہر منظم عمل کے لیے اوقات کی تعین ضروری ہے کیونکہ اگر وقت متعین نہ ہو تو انسان چوبیس گھنٹے اسی لیت و لعل میں گزار دے گا کہ "اب کرونگا"، "پھر کروں گا" وقت مقرر ہونے سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب وہ وقت آتا ہے تو انسان کو اس کام کی یاد دلا دیتا ہے ۔ پھر تعین اوقات میں وہ اصول وحدت، جو اسلام کا اصلی شعار ہے، بھی مدنظر ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسان جو مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔ اوقات نماز کے متعین اوقات ہیں۔ سب وحدت کا مرقع بن کر عبادت خدا میں بیک وقت مصروف ہو جاتے ہیں — اگر

طلوع وغروب آفتاب کا فرق اس میں کچھ خلل پیدا کرنا بھی چاہے تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ آفتاب ایک جگہ جس حالت میں ہوتا ہے اُسی حالت میں جب دوسری جگہ ہوگا تو نماز کا فرض اس وقت وہاں ادا کیا جائے گا پس ان مجموعی مصالح کے پیشِ نظر ضرورت تھی کہ نماز کے لیے اوقات مقرر ہوں۔

دوسرے مذہبوں میں نماز کے اوقات

اسلیے دنیا کے تمام مذہبوں نے عبادت کے اوقات کا تقرر ضروری سمجھا جاتا ہے ہندو آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ زردشتی طلوع کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں رومن کیتھولک عیسائی طلوع سے قبل، پھر شام کو پھر رات کو دعا مانگتے ہیں۔ یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو "تِفِلاّ" کہتے ہیں

نماز کے لیے فطری اوقات

اپنی فطری اور نوعی ضرورتوں کی وجہ سے انسان فرشتوں کی طرح شب وروز دعا و نماز میں مصروف نہیں رہ سکتا اس لیے اسلام نے چند مناسب وقت جو اس کے فطری مشاغل سے فرصت کے ہیں۔ نماز وعبادت کے لیے مقرر کر دیے ہیں صبح کو انسان تازہ دم بیدار ہوتا ہے اس وقت صبح کی نماز پڑھے دوپہر تک کام کر کے ذرا سستاتا ہے یہ وقت ظہر کے لیے

مقرر ہوا پھر سہ پہر تک بقیہ کام سے فارغ ہو کر سیر و تفریح کا موقعہ آتا ہے اس وقت عصر کی نماز ادا کر لی جائے شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے یہ مغرب کی نماز کا وقت ٹھہرایا گیا پھر کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام خواب کے لیے آمادہ ہوتا ہے اس وقت عشا کی نماز پڑھ لے۔ طلوع آفتاب سے دوپہر تک چونکہ انسان کی مصروفیت کاروبار کے اور عشا سے لے کر صبح تک راحت و آرام کے اصلی گھنٹے تھے اس لیے ان کے بیچ میں کوئی نماز فرض نہیں کی گئی بقیہ اوقات انسان کے مختلف کاموں کے ہیں انہی کاموں کے اوقات کے شروع میں نماز پنجگانہ فرض ہوتی ہے۔

اسلامی نماز کے اوقات کا ایک اور نکتہ

ان فطری مشاغل کے لحاظ کے علاوہ اوقات نماز کے متعین کرنے میں ایک اور نکتہ آفتاب پرستی کے بطلان کا بھی پیش نظر ہے۔ ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی اور خاص طور سے اس کے لیے طلوع، عروج کامل یعنی وقت نیمروز اور غروب کے وقت متعین تھے۔ اسی لیے اسلام نے ان تینوں وقت میں نماز پڑھنا حرام قرار دیا۔ فجر کی نماز کا وقت اس وقت تک ہے جب تک کہ آفتاب پردۂ عدم سے نہ نکلا ہو اس کے بعد سے قبل زوال تک جو آفتاب کے

عروج کا وقت ہے اسلام نے کوئی نماز فرض نہیں کی۔ بلکہ جب وہ انتہائی عروج پر پہنچکر تنزل اختیار کرتا ہے اس کے بعد بقیہ نمازیں فرض ہیں اور اس تنزل کے بھی تین درجے ہیں۔ جب[۱] وہ سمت الرؤس سے نیچے اترتا ہے جسے زوال کہتے ہیں۔ یہ نماز ظہر کا وقت ہے، پھر جب[۲] وہ نظر کے دائرہ تقابل سے گرتا ہے جسے عصر کہتے ہیں یہ نماز عصر کا وقت ہے اور پھر جب[۳] وہ حد نظر سے نیچے گر جاتا ہے جسے غروب کہتے ہیں۔ یہ نماز مغرب کا وقت ہے، نماز عشا کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ تاریکی کی گہری قبر میں دفن ہو جاتا ہے۔ غرض یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ یہ نمازیں آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے مقابلہ میں خدائے برحق کی عبادت ہیں اور یہی وہ اوقات ہیں جو آفتاب پرستی کے چراغ کو گل کرنے والے موحّد اول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملت ابراہیمی کی نمازوں کے لیے مقرر کیے تھے۔ دین محمدی ملت ابراہیمی کا ہی دوسرا نام ہے اس لیے اس میں بھی وہی اوقات برقرار رکھے گئے۔ اور اسی طرف قرآن کی یہ آیت خاص طور سے اشارہ کر رہی ہے۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔	نماز قائم کر آفتاب کے انحطاط کے وقت رات کی تاریکی تک (یعنی ظہر، عصر، مغرب، عشا، اور فجر کی نماز

اوقات و طریق نماز اور قرآن قرآن میں ایک جامع آیت ہے جس میں لڑائی کی حالت میں بھی نماز ادا کرنے کی تفصیل مذکور ہے۔

"نمازوں اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور اللہ کے لیے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو۔ پھر اگر خوف ہو تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم مامون ہو جاؤ تو خدا کو اسطرح یاد کرو جس طرح اُس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے"

اس آیت میں "جس طرح اُس نے سکھایا" کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ نماز و اوقات وغیرہ سب خدا نے سکھائے اور بتائے ہیں۔ جس کی تفصیل احادیث اور مسلمانوں کے متواتر عمل میں موجود ہے اور قران میں اس کے عملی حوالے مذکور ہیں۔

نماز کی پابندی قرآن نے نماز کی نگہداشت اور پابندی کے لیے محافظت کا لفظ استعمال کیا جس کے معنی کی وسعت میں علاوہ پابندی سے ادا کرنے کے، وقت پر اور مع تمام شرائط و آداب کے ادا کرنا بھی داخل ہے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ معارج، سورۃ مومنین اور سورۃ انعام میں محافظت کے الفاظ ہیں اور سورۃ معارج میں ایک آیت اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ (جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں) میں دوام کا لفظ آیا ہے۔ مقصد سب کا یہی ہے کہ مسلمان کو کسی حال

میں نماز معاف نہیں، پابندی سے ہر وقت تمام شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

تقررِ وقت

قرآن میں ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے)

قرآن نے ادائے نماز کے لیے تین لفظ استعمال کیے ہیں، صلوٰۃ یا اِقَامَتِ صَلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ ان میں سے تیسرا لفظ عام تسبیح اور یاد خدا کے معنی میں بھی مستعمل ہوا ہے مگر جہاں قرآن میں اس کے ساتھ وقت کی تخصیص ہے اس سے نماز ہی مراد ہے چنانچہ فرمایا۔

۱۔ "رات کو کھڑا ہو مگر کچھ کم یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا دے اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ" یہاں رات میں کھڑے ہونے سے نماز میں کھڑا ہونا مراد ہے۔

۲۔ "اور تو اس کی تسبیح صبح کو (فجر) اور سہ پہر (عصر) کو بیان کیا کر" اس فجر اور عصر کی نماز مراد ہے۔

۳۔ "خدا کی تسبیح پڑھو جب شام کرو (نماز مغرب) اور جب صبح کرو (نماز فجر) اور اس کی حمد ہو آسمانوں میں اور زمین میں، اور سہ پہر کو (نماز عصر) اور جب تم دوپہر کرو۔ (نماز ظہر)

۴۔ "اور عشا کی نماز کے بعد"

ہم نے اُن متعدد آیات میں سے جن میں نماز کا ذکر اوقات کی قید کے ساتھ ہے یہ چند آیات نقل کر دی ہیں جن میں پانچوں نماز کی اوقات بندی کا ذکر ہے ۔

اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز غربت اور مظلومی کے ساتھ ہوا اس لیے اولاً نماز نہ تھی۔ لوگ چھپ کر یادِ خدا کرتے تھے۔ سب سے پہلے سورۂ مزمل میں جو مکی سورتوں میں سے ہے یہ آیتیں آئیں۔

تہجد "اے کملی والے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اُٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ"

آخر میں ہے۔

"بے شبہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے"

یعنی اس وقت رات کو نماز اور دن کو آرام کا حکم تھا اور یہ حکم ابتدائی تین برسوں تک کے لیے تھا کیونکہ جہاں رسول اللہ کو اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت اسلام کا حکم آیا ہے وہیں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور رات کو نمازیوں کو دیکھتے پھرا کرتے تھے کہ کون نماز پڑھتا ہے اور کون سویا ہوا ہے جس کو جگانا چاہیے۔

فجر و عشا اس کے بعد جب پہلے کی نسبت اطمینان حاصل ہوا تو رات کی تہجد کی طویل نماز کے علاوہ فجر و عشا کی کا نماز کا اضافہ ہوا فرمایا۔

"اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کر بیشک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (نماز کو) کھڑا ہو اور کچھ رات کے حصہ (نماز عشا) میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت (نماز فجر میں)"

عصر یہ آیت سورۂ طور کی ہے جو مکی ہے اس کے بعد سورۂ دہر میں اسی مضمون صبر و تحمل کی اور اتری اور نماز عصر کا اضافہ کیا گیا، فرمایا۔

"اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کر، اور ان مخالفوں (قریش) میں سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گذار کا کہنا نہ مان،
اور صبح کو (نماز فجر میں) اور تیسرے پہر کو (نماز عصر میں)
اپنے پروردگار کا نام لے اور کچھ رات گئے (نماز عشا میں)
اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک (تہجد میں) اس کی تسبیح کر"

اس آیت سے تہجد کے علاوہ بُکرۃً (صبح) سے نماز فجر اور اَصیلاً (سہ پہر) سے آخر دن اور من اللیل (رات) کی تین نمازوں کی تصریح تو ہوتی ہے۔ مگر اصیل میں ظہر و عصر اور من اللیل میں مغرب و عشا کی کوئی تفریق نہیں ہوتی نیز ابھی تک نماز کو ان اذنا

سے مخصوص کرنے کے باوجود تسبیح اور تحمید کے نام سے یاد کیا گیا اس کے بعد اب سورۂ ہود میں ان تینوں نمازوں کو صلوٰۃ کا لقب دیا جاتا ہے، فرمایا

"دن کے دونوں کناروں (فجر و عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے (عشا) میں نماز (صلوٰۃ) کھڑی کیا کر"

مغرب پھر سورۂ ق میں جو مکی ہے سب سے پہلے رات کی نمازوں (مغرب و عشا) کو علیحدہ کیا جاتا ہے، فرمایا۔

"پس اے رسولؐ جو کچھ (مخالف) کہتے ہیں اس پر صبر کر، اور آفتاب کے طلوع سے پہلے (نماز فجر میں) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (نماز عصر میں) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کیا کر

اس کے بعد فرمایا۔

"اور کچھ رات گئے پر (نماز عشا میں) اس کی تسبیح کیا کر اور آفتاب کے سجدہ کرنے (یعنی غروب ہونے کے بعد)

اس آیت میں تلقین صبر کفار قریش کی ایذا رسانی پر ہے جو نمازوں کی وجہ سے ہی حضورؐ کے ایذا اور تحقیر کے درپے تھے اس لیے اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلے میں رات سے آغاز کیا گیا کیونکہ یہ نسبتاً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا۔ اب صرف ظہر اور عصر یہ دو نمازیں تفصیل طلب رہ گئیں۔ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ان کی تفصیل کر دی گئی۔ فرمایا۔

"اللہ کی تسبیح کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اسی کی حمد ہے آسمانوں اور زمین میں، اور اخیر دن کو (نماز عصر میں) اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو (تو نماز ظہر میں)"

قرآن کے تفصیلی مطالعہ سے نماز پنجگانہ کا ذکر مندرجہ سورتوں میں بالاجمال یا بہ تصریح ثابت ہوتا ہے۔

فجر:- (بہ تصریح) سورہ طٰہٰ، طور، دہر، ق، روم اور نور میں۔

ظہر:- (بالاجمال) دہر، ق، طٰہٰ اور اسراء میں (بہ تصریح) اسراء اور روم میں۔

عصر:- (بہ تصریح) بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، ق اور روم میں۔

مغرب:- (بالاجمال) ہود، طٰہٰ اور روم میں (بہ تصریح) ق میں

عشا:- (بصورت صلوٰۃ اللیل) مزمل، طور اور دہر میں (بصورت عشا بالاجمال) طٰہٰ، ہود اور روم میں (بہ تصریح) ق اور ہود میں

جمع بین الصلوٰتین

دو نمازوں کو بیک وقت ادا کرنے کا نکتہ

چونکہ ظہر و عصر کو قرآن نے اولاً مجملاً لفظ قبل الغروب یا اصیل (آخر دن)، طرفی النہار کے مشترک نام دیے پھر سورہ روم میں ان دونوں کو الگ الگ کیا اسی طرح مغرب و عشا کو اولاً حِیْنَ تُمْسُوْنَ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کیا ہے اس سے ادھر اشارہ ہے کہ یہ دونوں ایک بھی ہیں اور الگ الگ بھی اس لیے کسی اشد ضرورت مثلاً سفر وغیرہ میں ان کو ملا کر بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن صبح کی نماز کا ذکر ہمیشہ الگ ہی کیا گیا۔ اس لیے اس کو کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا بعض اوقات میں جمع بین الصلوٰتین کا عمل اسی قرآنی نکتہ کی تشریح ہے۔

اوقات پنجگانہ اور آیت اسراء

نماز کے پانچوں اوقات کی تعین معراج میں ہوئی جو ہجرت سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے۔ اگرچہ سورۂ ق اور روم کی آیات میں

اوقات پنجگانہ کا ذکر موجود جو آیت اسراء (معراج) سے قبل نازل ہو چکی تھیں مگر ان میں نماز کا ذکر تسبیح و تحمید کے ساتھ تھا اقامت الصلوٰۃ کے لفظ سے اوقات پنجگانہ کا ذکر پہلی بار سورہ اسراء میں آیا ہے فرمایا۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا۔	آفتاب کے جھکاؤ رات کی تاریکی تک نماز قائم کیا کر اور فجر کی قراءت قائم کر بے شک فجر کی قراٰت میں حضور ہوتا ہے۔

اس آیت میں دُلُوْکِ (آفتاب کے جھکاؤ) میں تین نمازوں ظہر، عصر، اور مغرب کے اوقات کا بیان ہے اور اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (رات کی تاریکی تک) میں نماز عشا اور قُرْاٰنَ الْفَجْرِ میں نماز فجر کے وقت کا بصراحت ذکر ہے، اس میں لفظ دلوک کی تشریح سب سے اہم ہے۔

دلوک کی تشریح اہل عرب دلوک کو تین معنوں میں بولتے ہیں۔ اور یہ آفتاب کی تین حالتیں ہیں۔ زوال[۱]، آفتاب[۲] کا دائرہ نگاہ کے تقابل سے نیچے گرنا، اور غروب[۳] ان تینوں دلوکات پر تین نمازیں ظہر، عصر اور مغرب فرض کی گئیں تاکہ آفتاب پرستوں کے اعتقاد باطل کا رد ہو کہ آفتاب جو درجہ بدرجہ ڈھلتا ہوا آغوش فنا میں جانے کی تیاری کر رہا ہے ہرگز لائق پرستش نہیں، مستحق

عبادت خدائے برحق ہی ہے جس کے لیے ہبوط و زوال نہیں۔
دلوک کے ان تین مدارج کے لیے ثبوت کے واسطے کلام عرب سے شواہد پیش کرنا ضروری ہے تاکہ اس آیت سے اوقات پنجگانہ کے ثبوت میں کسی کو عذر نہ رہے۔

(۱) دلوک بمعنی زوال یعنی سمت الراس سے گرنا ڈھلنا:۔ لسان العرب میں ہے "اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں، تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لیے جب آفتاب دوپہر کو جھک جائے تو اُسے دالکہ (ڈھلنے والا) کہتے ہیں"۔

(۲) دلوک بمعنی غروب (مغرب):۔ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں "اور آفتاب جب ڈوب جاتا ہے۔ تب بھی اس کو دالکہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ دونوں حالتوں میں جھک جاتا ہے۔ نیز جب آفتاب غروب ہو تو عرب کہا کرتے ہیں۔ دلکتِ الشمسُ یعنی آفتاب ڈوب گیا"۔

(۳) دلوک بمعنی وقت (عصر):۔ لسان العرب کا ہی بیان ہے "اور کہا گیا ہے کہ دَلکتِ الشمسُ کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا اور غروب کے واسطے جھک گیا"۔ اسی سلسلہ عربی جاہلی شاعر کا شعر پیش کیا ہے جس میں آفتاب کے نقطہ تقابل نظر کرنے کو دلوک کہا گیا ہے اور یہی وقت عصر ہے۔ شاعر نے اس مطلب

کو دَلَکَتْ بِرَاحِ کے فقرہ میں ادا کیا ہے یعنی آفتاب، ہتیلی سے جھک گیا، اس سلسلہ میں زجّاج کا قول ہے کہ "یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں، جبکہ آفتاب اتنا جھک جائے کہ دیکھنے والا اس کو شعاع کی چکاچوند سے بچنے کے لیے آنکھ پر ہتیلی رکھ لیتا ہے" تو یہاں زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے۔

چونکہ دلوک سورج کے اِن تینوں جھکاؤ پر بولا جاتا ہے، اسی لیے بعض اہل لغت نے تسامحاً یہ کہہ دیا کہ دلوک زوال آفتاب سے لیکر غروب تک وقت کو کہتے ہیں۔ ورنہ حقیقتاً دلوک کا اطلاق مذکورہ بالا تین قسم کے جھکاؤ پہ ہوتا ہے ایک بوقت ظہر یعنی سمت الراس سے جھکنا دوسرا بوقت عصر یعنی سمت نظر سے جھکنا اور تیسرا بوقت مغرب، سمتِ افق سے گرجانا اور غائب ہوجانا۔

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ دلوک میں ظہر، عصر، اور مغرب تینوں نمازوں کے اوقات کا بیان آگیا اس کے بعد غَسَقِ اللّیل اور قرآن الفجر سے نماز عشا اور فجر کا مراد ہونا صاف ظاہر ہے اس طرح اس آیت اسرا میں اقامت صلوۃ کے اوقات پنجگانہ کی پوری تشریح آگئی۔

اوقات نماز میں ایک راز

اس آیت کے مطابق وہ حدیث بھی جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات

پنجگانہ کا ذکر ہے۔ سلسلہ نماز کا آغاز ظہر سے عشا تک دو دو تین تین گھنٹوں کے فصل سے کر کے پھر تقریبًا سات گھنٹوں کے بعد نماز فجر کا وقت متعین کرتی ہے۔ اس کے بعد تقریبًا اتنے ہی فصل سے پھر نماز ظہر کا وقت آتا ہے اور پھر اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی رات اور دن میں تقریبًا مساوی وقت آرام اور کاروبار کے رکھ دیا گیا ہے۔ رات میں تقریبًا سات گھنٹے مسلسل آرام اور دن میں اتنی دیر مسلسل کام کیا جائے۔

اوقات پنجگانہ اور ایک اور آیت

سورہ طٰہ میں بھی ایک آیت میں پانچوں وقت کا ذکر ہے۔ فرمایا

"اور اپنے رب کی حمد کر کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے (نماز فجر[1] میں) اور آفتاب کے ڈوبنے سے پہلے (عصر[2] میں) اور رات کے کچھ وقت (نماز عشا[3]) میں اور دن کے کناروں (ظہر[4] و مغرب[5]) میں۔

اس آیت میں اطراف النہار (دن کے کناروں میں) کا لفظ محتاج تشریح ہے، گو دن کے کنارے دو[2] ہیں۔ اور اطراف کا لفظ جمع ہے مگر عربی محاورات میں دو[2] کو تشنیہ کے بجائے بعض اوقات جمع سے بھی تعبیر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مشرق و مغرب کو کہیں مشرقین و مغربین کہا گیا ہے اور کہیں مشارق و مغارب۔

پھر دن کے دو کناروں سے ابتدائی کنارہ (یعنی فجر) اور آخری

(یعنی مغرب یا عصر) مراد نہیں، ورنہ فجر کا ذکر بکر رہو جائے گا۔ کیونکہ آفتاب نکلنے سے پہلے نماز کا ذکر آچکا ہے بلکہ دن کے دونوں حصوں (یعنی صبح سے دوپہر تک اور دوپہر سے مغرب تک) کے آخری کنارے مراد ہیں۔ پہلے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دوسرے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے لیکن عصر کا ذکر چونکہ پہلے آچکا ہے اس لیے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

متفرق آیتوں سے ثبوت

(۱) نماز ظہر کے لیے فرمایا "زوال کے وقت نماز کھڑی کر"

(۲) نماز عصر کے لیے ارشاد ہوا "اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر"

(۳) نماز مغرب کے لیے حکم ہوا "اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی (مغرب)) کناروں میں نماز قائم کیا کر"۔

(۴) نماز فجر کا ذکر اس حکم کے ذیل میں ہوا کہ بے پکارے زنانہ کمرہ میں "نماز فجر سے پہلے" نہ جایا کرو۔

(۵) اسی موقعہ پر نماز عشا کا ذکر ہے اور "نماز عشا کے بعد" بھی نہ جایا کرو

نماز پنجگانہ حدیث وسنت کی نظر میں

تمام انبیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی لائی ہوئی شریعت محض نظری اور خیالی نہیں بلکہ عملی ہے، احکام شریعت پر خود حضور نے عمل کیا اور اپنے پیرودں کو ہدایت کی چنانچہ

حضورؐ نے اپنے عمل سے نماز کے اوقات، ارکان، آداب اور شرائط میں ایک ایک بات کی پوری اور عملی تشریح کر کے دکھا دی۔ نماز کے فرض ہونے کے بعد سے مدینہ میں مسلسل دس برس تک روزانہ پانچ دفعہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ آپؐ نماز ادا کرتے رہے، غرض آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل رہا۔ آپ کے تمام خلفا اور متبعین کا بھی ہر جگہ اور سفر و حضر کی ہر حالت میں یہی معمول رہا، اس تسلسل عمل اور اس کی تاکید بلیغ کا مقصد یہی تھا کہ دوسرے پیغمبروں کے طریق عبادت کی طرح پیروں کے ترک عمل سے اس آخری شریعت کا طریق عبادت مشکوک اور مشتبہ نہ ہونے پائے جس کے بعد کوئی اصلاح کرنے والی شریعت نہیں آئے گی۔

یہ پانچ نمازیں معراج میں فرض ہوئیں، جن کا ذکر حضور نے معراج کی طویل حدیث میں فرمایا ہے کہ شب روز میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں، چونکہ خود قرآن نے نیکی کا ثواب دس گنا بتایا ہے اس لئے یقیناً پانچ نمازیں پچاس کے برابر ہوئیں۔

فرضیت نماز کے بعد خود جبرئیل نے اتر کر اور ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی چنانچہ حضورؐ نے فرمایا۔

"جبرئیل اُترے اور انھوں نے میری امامت کی میں نے اُن کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی

پھر پڑھی" حضور یہ فقرے فرماتے ہوئے انگلی سے گنتے جاتے تھے

اوقات نماز کی تعیین کے بارے میں فرمایا "جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت سورج کی پہلی کرن نکلتے تک ہے پھر جب ظہر پڑھو تو اس کا وقت عصر کے وقت سے پہلے تک ہے پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑجائے پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے پھر جب عشا پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے"۔

حضرت جابرؓ ایک دوسرے صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ حضورؐ ظہر[۱] کی نماز دوپہر میں پڑھتے تھے اور عصر[۲] سورج کے باقی رہتے ہوئے اور مغرب[۳] سورج ڈوبنے پر اور عشا[۴] میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور فجر[۵] اندھیرے میں پڑھتے تھے

فرائض پنجگانہ کے بعد تہجد کی حیثیت

تہجد کی نماز جو پہلے فرض تھی اب نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد نفل ہوگئی چنانچہ سورۂ اسراء کی اسی آیت میں جس میں نماز پنجگانہ کی فرضیت کا حکم ہے آخر میں فرمایا۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ

اور رات کے حصہ میں اٹھکر تہجد کی نماز پڑھا اپنے لیے (اوقات مقررہ سے) زائد نماز (نفل) کے طور پر

یعنی جب تک اور نمازیں نہ تھیں تو یہ رات کی طویل نماز ہی سب کے قائم مقام تھی پھر جوں جوں نمازیں فرض ہوتی گئیں اس میں تخفیف ہوتی گئی۔ چنانچہ دو[۲] تین[۳] نمازوں کے بعد ہی حکم ہو گیا۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (تہجد میں جتنا پڑھنا آسان ہو اتنا قرآن پڑھو) پھر جب اوقات پنجگانہ کی تکمیل ہو گئی تو تہجد کی فرضیت ساقط ہو کر یہ نماز نفل رہ گئی۔

قِبلہ

قِبلہ کی ضرورت کیوں ہے؟ دوسرے اہل مذاہب کا قبلہ کیا تھا؟ اسلام کا قبلہ کونسا ہے؟ اور اس کی کیا حیثیت اور اس میں کیا مصالح ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس عنوان کے تحت میں ملے گا

ضرورت قبلہ انسان کے ہر کام کے لیے جس طرح زمانہ کی ضرورت ہے، اسی طرح مکان کی بھی ظاہر کہ کوئی بھی کام کرتے وقت اس کا رخ کسی نہ کسی سمت ہوگا پس تعین اوقات کی طرح قبلہ کی تعیین بھی نظام وحدت اور جماعت کی شیرازہ بندی کے لیے ضروری تھی ورنہ ہر ایک شخص اگر الگ الگ سمت کی طرف رخ کر لیتا تو علاوہ نظام وحدت کے خلاف ہونے کے ایک ہی مسجد میں یہ صورت عجیب تماشے کی ہو جاتی۔ اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت مقرر کی گئی ہے۔

دوسرے مذاہب کا قبلہ چنانچہ صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو آفتاب پرست آفتاب کو آتش پرست آگ کو اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت سامنے

رکھ کر عبادت کرتے تھے۔ اکثر شامی قومیں حتیٰ کہ یہاں کے یہود اور عیسائی بھی مشرق اور مطلع آفتاب کو قبلہ بنائے ہُوئے تھے، بنی اسرائیل میں بھی قبلہ کی ضرورت مسلم تھی، توراۃ سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب پتھروں سے گھیر کر "بیت ایل" ایک خدا کا گھر بنا لیتے تھے، بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے تمام صحیفوں میں موجود ہے، اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کی تھی۔ اسی تفصیل کی طرف قران نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا۔ — اور ہر ایک اُمّت کے لیے ایک قبلہ ہے جدھر وہ پھرتی ہے۔

ابراہیمیؑ قوموں میں مرکزی مسجدیں دو تھیں، بیت المقدس اور خانہ کعبہ۔

حضرت اسحٰقؑ اور ان کی اولاد کو بیت المقدس کی تولیت حاصل تھی اور خانہ کعبہ کے متولی حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے۔ آنحضرتؐ جب تک مکّہ میں رہے تو نماز میں اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے تھے، لیکن مدینہ میں یہ صورت نہ ہو سکتی تھی کیونکہ بیت المقدس جانب شمال اور خانہ کعبہ جانب جنوب میں واقع تھا۔

اسلام کا قبلہ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں

بیت المقدس کی طرف جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا رخ کیا کرتے تھے کیونکہ ابھی تک کعبہ کے قبلہ ہونے کا حکم نازل نہیں ہُوا تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش تھی کہ خانۂ کعبہ قبلہ قرار پائے چنانچہ قرآن میں ہے

"ہم آسمان کی طرف تیرے چہرہ کی لوٹ پلٹ کو دیکھ رہے پس ہم ضرور تیرا رخ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے"

لیکن سب سے پہلے یہ بات بتا دی گئی کہ خدا کو کسی خاص سمت سے تعلق نہیں، وہ بے جہت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں، فرمایا۔

"اور خدا ہی کا ہے پورب اور پچھم تو جدھر رخ کرو اُدھر ہی خُدا کی ذات ہے"

اس فرمان نے قبلہ کے تعین کے سلسلہ میں جو شائبہ شرک ہو سکتا تھا اس کو بالکل زائل کر دیا۔ یہود کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد بیت المقدس کے بجائے مغربی مسجد خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ ٹھہرایا گیا ان کو خطاب کر کے فرمایا۔

"نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، اور پیغمبروں پر ایمان لائے الخ"

یعنی وہ سمت یا جگہ جس کی طرف نماز میں مُنہ کیا جائے فی نفسہ عبادت کے لیے ضروری نہیں ہے، قبلہ کی ضرورت صرف اس

غرض سے ہے کہ اُمت کے نظام وحدت کو قائم رکھا جائے اِسلیے سنہ ۱ھ میں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہُوا، چنانچہ فرمایا۔

"پس تو اپنا مُنہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لے اور تم لوگ جہاں بھی ہو اُسی کی طرف اپنا مُنہ پھیرو"

اسلامی قبلہ کی حیثیت اور مصالح

اسلام نے کسی سمت کو نہیں بلکہ مرکزی مسجد خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے بیک وقت نماز پڑھی جا سکتی ہے، اس میں ایک لطیف رمز یہ ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے دوسرا فائدہ کسی خاص سمت کے بجائے کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے سے یہ ہوا کہ سمتوں کی مرکزی چیزوں مثلاً آفتاب یا قطب شمالی کی معبودیت کا شائبہ جاتا رہا جس سے بُت پرستی اور ستارہ پرستی کا خاتمہ ہو گیا۔

بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے میں حسب ذیل مصلحتیں ہیں۔

(۱) قبلہ یا کوئی مصنوعی شے مثلاً کوئی چراغ، شمع، تصویر، مجسمہ، بُت، ستارے آفتاب، پانی اور آگ ہو سکتی تھی جن کی طرف ہر شخص ہر جگہ اور ہر ملک میں رُخ کر سکے جیسا کہ دوسرے اہل مذاہب ان چیزوں کو قبلہ یا معبود مانتے تھے، یا کوئی سمت مثلاً شمال یا مشرق قبلہ ہو سکتی تھی پہلی سمت میں قطب تھا اور دوسری میں آفتاب

بیت المقدس بھی جانب شمال میں واقع تھا۔ اس لیے اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ کھلی پرستی میں گرفتار ہو جاتا اس لیے اس کے لیے یا ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کی علامات کو قائم رکھے۔

(۲) یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوب و مغرب کی سمتوں سے کسی کو قبلہ بنا لیا جاتا لیکن ظاہر ہے ہر سمت کی تخصیص کسی نہ کسی ستارہ کی تخصیص کی بنا پر ہو سکتی تھی اور اس تخصیص و ترجیح سے دین توحید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

(۳) علاوہ ازیں ملت ابراہیمی نے ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو قبلہ بنایا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے پاس دو ہی مرکزی مسجدیں تھیں بیت المقدس اور خانہ کعبہ، پہلی مسجد بنی اسرائیل کا قبلہ بنی اور دوسری بنی اسمٰعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

(۴) اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے پیشتر بنا ہے جس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ تھے، فرمایا۔

"بے شک سب سے پہلا (خدا کا) مبارک گھر جو انسانوں کے لیے بنا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔"

نیز خانہ کعبہ کے قبلہ اوّل ہونے سے عہد اسلام کے یہودی بھی انکار نہ کر سکتے تھے قرآن میں ہے۔

"اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ یہ (خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا)

حق ہے اُن کے پروردگار کی طرف سے"

پس اسلام کے آنے کے بعد قبلہ بنی اسرائیل بیت المقدس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی اور خانہ کعبہ جو بنی اسمٰعیلؑ سے متعلق تھا قبلہ ٹھہرا، جس کا عہد پہلے سے خدا کے ساتھ باندھا ہُوا تھا قرآن میں ہے۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔

اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر (خانہ کعبہ) کو طواف کرنیوالوں، اعتکاف کرنیوالوں رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنیوالوں کے لیے پاک کرد۔

غرض یہ ایک رمزِ الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے خدا کے علم میں تھا اور اُسی کی بنا پر حضور کی ہجرت کے بعد بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ عالم کا روحانی مرکز قرار پایا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے آوازِ توحید بلند کی، جو اس لحاظ سے خدا کا پہلا گھر تھا، جو دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور حظیرۃ القدس (بارگاہ خداوندی) کا عکس ہے؛ اسی لیے حکم ہُوا۔

"(اے پیغمبر!) اور تو جہاں بھی نکلے مسجدِ حرام ہی کی طرف مُنہ کر"

پس اسلام کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان فریضہ عبودیت ادا کرتے وقت وہاں کھڑا ہو، جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہُوے تھے۔ لیکن چونکہ ایسا ہر جگہ ممکن تھا، اس لیے

خانہ کعبہ کی سمت مُنہ کر کے کھڑا ہونا کافی سمجھا گیا، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اُس کی توجہ ہر طرف ہے۔ اسی لیے فرمایا۔

"پس جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا رُخ ہے"

اور اسی لیے بالفرض اگر خانہ کعبہ کی دیواریں اور چھت ٹوٹ بھی جائیں صرف خالی فضا رہ جائے تب بھی قبلہ رہے گا اور خود خانہ کعبہ اور اس کی چھت پر ہر سمت رخ کر کے نماز جائز ہے۔ نیز دوسری جگہ اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر خیال ہو اُدھر ہی کو رُخ کر کے نماز پڑھنا جائز ہے۔ سواری میں نماز نفل سواری کے رُخ پر پڑھ لینا جائز ہے، لڑائی میں شدت خوف کے وقت قبلہ کی قید اُٹھ جاتی ہے۔ یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی تردید کے لیے کافی ہیں جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے مخالفین کی طرف سے پیدا کی جاتی ہیں یہ قبلہ گویا ملت ابراہیمیؑ کی پیروی کا عملی ثبوت، پیروی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے اگر کوئی بالفرض فضائے آسمانی سے عالم کے مسلمانوں کو بحالت نماز دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف بشکل محیط دائرہ مسلمانان عالم خدا کے آگے سر بسجود ہیں۔

سوالات

(۱) نماز کے اوقات متعین کرنے کی حکمت کیا ہے۔ نیز اسلامی نماز

کے اوقات کا مقابلہ دوسرے مذہبوں کے اوقات نماز سے کرو
(۲) اوقات نماز کی تدریجی تعین پر ایک جامع نوٹ لکھو۔
(۳) سورۂ اسراء کی اس آیت پر جس سے نماز پنجگانہ کے اوقات کی طرح اشارہ نکلتا ہے بشرح و بسط کلام کرو۔
(۴) حدیث کی رو سے اوقات نماز پر حضورؐ کے طرز عمل کی روشنی میں کلام کرو۔
(۵) تہجد کا درجہ نماز پنجگانہ کی فرضیت سے قبل کیا اور بعد میں کیا قرار پایا۔
(۶) اسلام اور دوسرے مذاہب کا تخیل قبلہ کے بارے کس حد تک مشترک ہے اور کہاں تک مختلف۔
(۷) اسلامی قبلہ کی حیثیت اور اس کی مصلحتوں پر روشنی ڈالو۔

رکعتوں کی تعداد

ایک بار قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ کی مرتب شکل کا نام رکعت ہے۔ فرض نماز کی رکعتیں کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار ہیں۔ کیونکہ اسلام کا مقصد خضوع و حضور کے ساتھ مسلمانوں پر سہولت رکھنا بھی تھا، اس لیے نہ ایک رکعت کی نماز رکھی کیونکہ وہ چند سکنڈ میں ختم ہو جانے کی وجہ سے خشوع و خضوع پیدا نہ کر سکتی اور نہ چار رکعتوں سے زیادہ کی نماز رکھی کیونکہ دیر لگنے سے جی گھبرا جاتا۔

مکہ میں کفار کی ایذا رسانی کی وجہ سے مسلمان چھپ کر رات کو نماز ادا کرتے تھے اس لیے تخفیف کے لحاظ سے اس وقت ہر نماز دو رکعت کی تھی، جب مدینہ پہنچکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر، اور عشا کی چار چار رکعتیں کر دی گئیں۔ مگر مسافر کے لیے وہی دو رکعتیں قائم رہیں کیونکہ سفر کی عارضی پریشانی جو تخفیف کا موجب تھی وہ اس کے لیے اب بھی باقی تھی۔

مغرب کی تین اور صبح کی دو رکعتیں ہر حال میں یکساں ہیں اس کی حکمت حضرت عائشہؓ نے یہ ارشاد فرمائی کہ مغرب دن کا وتر ہے،

اور صبح میں دو رکعتیں اس لیے ہیں کہ قرأت لمبی کی جائے۔
اس پر اسقدر اضافہ اور ہو سکتا ہے کہ آفتاب پرستی کے عقیدۂ باطل کے مقابلہ میں اس کے پردۂ عدم میں مستور جانے پر خدائے واحد کی پرستش کے اعلان و نشان کے طور پر نماز مغرب کی رکعتوں کی تعداد بھی وتر (طاق) رکھی گئی۔ کیونکہ دو کا عدد زوج تھا۔ اور ایک سے حضور اور خشوع و خضوع حاصل نہ ہو سکتا تھا ایک کے بعد قریبی طاق عدد تین ہی تھا۔ اس مفہوم کی تائید وتر والی حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور نے فرمایا۔

"اے قرآن والو! نماز وتر (طاق) پڑھا کرو کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر کو پسند کرتا ہے"۔

اور صبح کا وقت چونکہ فرحت بخش اور دعاؤ نماز کے لیے نہایت موزوں تھا، جس کے امتیاز کا ذکر خود قرآن نے ان لفظوں میں فرمایا ہے
اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا صبح کی نماز کی قرأت میں حضور ہوتا ہے
اس بنا پر شریعت نے رکعتوں کے بجائے اس وقت کی اصلی کیفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرأت کے طویل ہونے پر زور دیا چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لیکر سو آیتوں تک قرأت کرتے تھے اور اسی نسبت سے رکوع اور سجدہ بھی عام نمازوں کے مقابلہ میں طویل ہوتا تھا۔

رکعتوں کا قرآن سے ثبوت اگرچہ رکعتوں کی تعداد کا ثبوت حضورؐ

کے عمل اور صحابہؓ اور تمام مسلمانوں کے عملی تواتر سے قطعی درجہ تک پہنچا ہُوا ہے تاہم قرآن پاک میں صلوٰۃ خوف میں اس کی طرف عملی اشارہ موجود ہے کہ فوج کے دو حصے ہو کر پہلے ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کرے وہ واپس چلا جائے پھر دوسرا آکر ایک رکعت ادا کرے اس طرح امام کی دو رکعت اور فوج کے ہر حصہ کی ایک ایک رکعت ہوئی یہ اپنی دوسری رکعت کو موقع کے لحاظ سے ارکان کے ساتھ یا اشاروں سے ادا کریں گے یعنی خوف اور قصر کی حالت میں جب دو۲ رکعت ہوئیں تو حالت امن میں چار رکعتیں ہوں گی۔

نماز کے باطنی آداب

اقامت صلوٰۃ قران میں بار بار اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنے) کا لفظ استعمال ہوا۔ اس سے مراد نماز کو اس کے تمام ارکان و سنن اور آداب کے ساتھ ادا کرنا ہے، اسی لیے حالت خوف میں چونکہ بعض ارکان و شرائط معاف تھے تو اطمینان ہوتے ہی یہ حکم ہوا۔

"جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو (پورے ارکان و اداب کے ساتھ) قائم کرو"

پس نماز کو اطمینان، ارکان کے اعتدال اور باطنی خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا اقامت صلوٰۃ ہے جس کے بغیر نماز ناقص رہیگی۔

قنوت باطنی آداب میں دوسری چیز قنوت (ادب سے کھڑا ہونا) ہے صحابہ رضؓ کہتے ہیں۔ پہلے ہم نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے۔ مگر جب یہ آیت اُتری۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ — اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو

تو آنحضرت نے اس سے منع فرما دیا۔

لغت میں قنوت کے معنی حسب ذیل ہیں، اور ہر ایک ہی نماز میں مقصود و مراد ہیں۔
چپ[1] رہنا، بندگی کرنا[2]، دعا[3] مانگنا، عبادت[4] کرنا، کھڑے[5] رہنا، دیر[6] تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا۔

خشوع تیسری چیز خشوع ہے قرآن میں ہے "(وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں۔

لغت میں خشوع کے معنی یہ ہیں بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا اور ہر ادا سے عاجزی ظاہر ہونا۔ نماز میں خدا کے سامنے اسی عاجزی اور اُفتادگی کے اظہار کی ضرورت ہے۔

تبتّل چوتھی چیز تبتّل (دنیا سے کٹ جانا) ہے ایک مسلمان کا مقصد اصلی یہی ہے کہ دنیا سے کٹ کر خدا کا ہو رہے سورۂ مزّمّل نماز کے حکم کے ساتھ ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا — اپنے رب کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے ہوئے اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات محو ہو جانے چاہئیں۔ حضرت عمرو بن عبسہ رض کہتے ہیں، کہ حضور ص نے فرمایا (جب کوئی وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہوا پھر خدا کی حمد و ثنا کی اور خدا کی شان کے مناسب اس کی بزرگی کا اظہار کیا اور دل کو

خدا کے لیے ہر چیز سے خالی کر لیا (وَفَرَّغَ قَلْبَهٗ لِلّٰهِ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے ابھی ماں سے پیدا ہُوا ہو"

تضرع تضرع کے معنی عجز و زاری کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں، نماز میں بندہ پر یہی کیفیت طاری ہونی چاہیے قرآن میں ہے "تم اپنے پروردگار کو (تضرع) مسکنت وزاری کے ساتھ اور (خُفْیَہ) دھیمی آواز سے پکارو۔

اخلاص یہ نماز کے باطنی آداب کا اصلی جوہر ہے اگر یہ نہیں تو نماز نماز نہیں، بلکہ ریا اور نمائش ہے قرآن میں ہے "اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو"

ذکر نماز خدا کی یاد کے لیے ہے اگر دل زبان کے ساتھ ہمنوا نہ ہو تو یہ خدا کی حقیقی یاد نہ ہو گی اسی لیے فرمایا "میری یاد کے لیے نماز قائم کرو"

فہم وتدبّر نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے معانی کی طرف دھیان رکھنا چاہیے تاکہ دل میں اثر پیدا ہو اسی لیے نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت کی گئی چنانچہ فرمایا "نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ تم بولو اس کو سمجھنے لگو" اس سے معلوم ہُوا نماز میں جو کچھ پڑھا جائے

اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ "جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ کیونکہ نیند کی حالت میں نماز پڑھنے سے ممکن ہے کہ بجائے دعا کے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو"۔

یہ باطنی آداب بھی ظاہری شرائط کی طرح تکمیل نماز کے لیے ضروری ہیں جن غفلت برتنا نماز سے غفلت برتنا ہے، ایسے نمازیوں پر قرآن نے پھٹکار بھیجی ہے۔ اس لیے وقت کے لحاظ کے اور ارکان میں اعتدال وغیرہ کے ساتھ خشوع وخضوع، تضرع اور فہم وتدبر ہونا بھی ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں ہدایات نبوی

ایک دفعہ ایک شخص نے جلدی میں نماز پڑھی تو حضورؐ نے فرمایا "اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی" اس نے دوبارہ اسی طرح پڑھی آپؐ نے پھر یہی فرمایا، جب تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یارسول اللہ کیسے پڑھوں؟ فرمایا "اس طرح اطمینان سے کھڑے ہو اور یوں قرأت کرو اور اس طرح سکون سے رکوع اور سجدہ کرو"

نیز حضورؐ نے فرمایا "کہ نماز میں سر اٹھا کر نہ دیکھا کرو، کیا تمھیں یہ ڈر نہیں کہ پھر تمھاری نظر واپس نہ آسکے"

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا "سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے" صحابہ نے پوچھا "نماز کی چوری کیا ہے" فرمایا رکوع

اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا، نماز میں سکون و اطمینان پیدا کرنے کے سلسلہ میں آپؐ نے متعدد ہدایات فرمائی ہیں ارشاد ہُوا "نماز ہو رہی ہو تو تم دوڑ کر نہ آؤ بلکہ سکون و وقار کے ساتھ آؤ"
اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب مثلاً بھوک یا ضرورت استنجا یا قضائے حاجت ہو تو پہلے اُس سے فراغت کر لی جائے۔
ایسے کپڑے پہننا یا نقش و نگار والے پردے سامنے لٹکانا جس سے توجہ ہٹ جائے مکروہ ہے۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ سامنے ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپؐ نے اسی وجہ سے اس کو اتروا دیا کہ نماز میں یکسوئی نہ رہی تھی۔
اوقات نماز کے سلسلہ میں بھی یہ اصول ملحوظ رکھا گیا اسی لیے گو ظہر کا وقت زوال کے بعد ہی ہو جاتا ہے مگر گرمی کی شدت کی وجہ سے اس میں کچھ توقف کرنے کا حکم دیا گیا، اسی لیے حضورؐ نے فرمایا" دوپہر کی گرمی جہنم کی آگ ہے اس لیے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔
نماز میں حضور کی روحانی کیفیت پیدا کرنے کے لیے آپؐ نے فرمایا "جب تم عبادت کرو تو یوں سمجھو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم نہیں دیکھ رہے تو خدا تو تم کو دیکھ رہا ہے"
تضرع و زاری کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے حضورؐ نے یہ ہدایت فرمائی "جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تمھاری نماز

ایسی ہونی چاہیے کہ گویا تم اُسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو"۔

سوالات

(۱) نماز کی رکعتوں کی تعداد پہلے کیا اور مسلمانوں کو کفار کی ایذا رسانی سے اطمینان ہو جانے کے بعد ان کی تعداد کیا مقرر ہوئی۔

(۲) رکعتوں کی تعداد کا ثبوت قرآن سے پیش کرو۔

(۳) صاحب کتاب نے بتایا ہے کہ نماز کے ظاہری آداب کے علاوہ نماز کے کچھ باطنی آداب بھی ہیں وہ آداب کیا ہیں اور ان کا درجۂ اہمیت کیا ہے

(۴) وہ چیزیں جو نماز کے خشوع و خضوع میں خلل انداز ہیں حضورؐ کے اسوہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے بچنے کی تدبیر لکھو۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز اصلاح اخلاق و تمدن کا بھی کارگر آلہ ہے، اس سلسلہ میں حضورؐ کے ذریعہ جو اصلاحات ہوئیں ان کا بیشتر حصہ نماز کی بدولت ہی حاصل ہوا، جن کا ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں پہلی چیز ستر پوشی کا اہتمام ہے کیونکہ شرم و حیا کا تقاضا جسم کے بعض حصوں کو چھپاتا ہے، عرب اس تہذیب سے نا آشنا تھے، غیر قریشی عورتیں حج کے لیے آتیں تو اپنے کپڑے اتار دیا کرتی تھیں۔ اسلام نے آتے ہی ستر پوشی کو ضروری قرار دے دیا یہاں تک کہ اس کے بغیر نماز بھی نا درست قرار دی گئی اسی طرح جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر پوش بنا دیا جس کا اندازہ افریقہ اور ہندوستان میں مسلمان اور غیر مسلمانوں کے لباسوں سے ہو سکتا ہے، نماز ایسی آرائش اور لباس سے بھی روکتی ہے جس میں بے حیائی پائی جائے اسی لیے نہایت باریک لباس پہننا اور تیز خوشبو لگا کر مسجد میں آنا عورتوں کے لیے ممنوع قرار دیا گیا۔

(۲) دوسرا درجہ طہارت و پاکیزگی کا ہے۔ اور اس کے حصول کا بڑا ذریعہ نماز بنی، اسلام نے نماز کی درستی کے لیے ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن، کپڑے اور نماز پڑھنے کی جگہ سب پاک و صاف ہوں، خدائے تعالےٰ نے پاک رہنے والوں کی تعریف میں فرمایا۔

"اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پاک و صاف رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک و صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے"

(۳) نماز کا تیسرا فائدہ بدن کی ہر طرح کی صفائی ہے، دن میں پانچ مرتبہ کھلے رہنے والے اعضا یعنی منہ، ہاتھ اور پاؤں کو دھونا، ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا ضروری ہے جس سے ناک کی سانس میں پیدا ہونے والے جراثیم دور ہو جاتے ہیں. جو طبی اصول سے بھی صحت کے لیے بہت مفید ہے، اسلام کے سوا دنیا کے کسی مذہب نے اس پر زور نہیں دیا۔

دانتوں کے صاف کرنے کے لیے پانچ وقت مسواک کرنے پر حضورؐ نے اس قدر زور دیا کہ اس کو تقریباً وجوب کا درجہ حاصل ہے، فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں اس کو ہر وضو میں واجب قرار دے دیتا"

پانی کی کمی کی وجہ سے عرب نہاتے کم تھے جس کی وجہ سے

بدن اور کپڑوں میں بُو پیدا ہو جاتی تھی۔ اس بنا پر اسلام نے کم از کم ہفتہ میں ایک بار جمعہ کو نہانے کی بڑی تاکید کی حضورؐ نے فرمایا کہ "جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر واجب ہے"۔

بعض حالات میں غسل فرض قرار دیا، قرآن کا حکم ہے " اگر تم جُنبی (ناپاک) ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

(۴) پابندی وقت عملی زندگی کی کامیابی کا اصلی راز ہے اس لیے انسان کی فطری آرام پسندی کی دور کرنے کے لیے کچھ اعمال پابندی اوقات کے ساتھ ادا کرنا فرض قرار دینا ضروری تھا۔ نماز کے اوقات کی پابندی اسی لیے ہے اس کا مفید اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے لیے بھی اوقات مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اُس کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پانے لگتے ہیں، گویا نمازوں کے اوقات اس کے کاموں کے لیے معیار بن جاتے ہیں۔ اسی لیے حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا " نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے پورا ناپا تو اس کو بھی پورا ناپ کر دیا جائے گا، اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمھیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے"

(۵) صحت کے لیے طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا نہایت مفید ہے، نماز کے پابند لوگ اس اصول کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے اسی لیے حضورؐ نے عشا کی نماز کے بعد فضول باتیں کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔

(٦) نماز سے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے۔ گناہ سے شرماتا اور اپنی غلطی پر انسان نادم ہونے لگتا ہے یعنی نماز اخلاقی حاسہ کو بیدار کرکے برائیوں سے بچاتی ہے اسی لیے فرمایا: "بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے"۔

(٧) نماز ہوشمندی کے ساتھ آیات خداوندی پر غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لیے دعا کرنے کا نام ہے اس لیے نماز بقائے ہوش چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہیں، پس پابند نماز اپنے ہوش و عقل کو کبھی گم نہ کرے گا

(٨) عبادات میں صرف نماز ہی ایسی چیز ہے جو منافقین اور مخلصین میں ذریعہ امتیاز بن سکتی ہے۔ کیونکہ حج عام اجتماع اور میلہ کا سا رنگ اختیار کرلینے کے وجہ سے ہر مذاق کے لوگوں کے لیے اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقہ ہر متمول خواہ مخلص ہو یا منافق اپنے فخر و جاہ کی خاطر دے سکتا ہے، روزہ میں چوری چھپے کھا لینے کا موقعہ حاصل ہے۔ صرف نماز باجماعت واقعی ظاہری و باطنی اخلاص کے بغیر ہر شخص کے لیے پابندی کے ساتھ ادا کرنا آسان نہیں اسی لیے قرآن نے منافقین کی یہ علامت بتائی۔ "جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسلمندی کے ساتھ اٹھتے ہیں"۔ نیز فرمایا "خشوع و خضوع والوں کے سوا نماز سب پر گراں

گذرتی ہے" خاص کر فجر و عشا اسی لیے حضورؐ نے فرمایا "منافقین پر فجر و عشا سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں۔

نماز کے لیے کعبہ کے قبلہ مقرر ہونے سے مخلصین و منافقین میں اور زیادہ تمیز ہو گئی۔ کیونکہ عرب بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی عظمت قائل تھے اور یہود مدینہ بیت المقدس کی اس لیے اسلام کے قبلہ اوّل یعنی بیت المقدس سے منافقین عرب کی پہچان ہو گئی اور کعبہ کے قبلہ بنانے سے منافقین یہود کی چنانچہ قرآن میں ہے۔

" اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا مگر صرف اسلیے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان سے الگ کر دیں۔ جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے"

(۹) نمازیں گویا تیاری جنگ کا نقشہ ہیں۔ اور باطل کی شکست اور حق کی فتح کے لیے لڑنا انسان کا فرض ہے ابو داؤد میں ہے

" آنحضرتؐ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر (اللہ اکبر) اور جب نیچے اترتا تھا تو تسبیح (سبحان اللہ) کہتا تھا نماز اسی طریقہ پر قائم کی گئی (یعنی اوپر اٹھو تو اللہ اکبر کہو اور رکوع اور سجدہ میں جاؤ تو تسبیح کرو)

نماز سپاہیانہ اطاعت امیر اور جفاکشی اور صف بندی سکھاتی ہے جو ایک امام کی اقتدا، برابری صفوف اور پانچ وقت اپنے راحت و تفریح کو چھوڑ کر یاد خدا کے لیے نکل پڑنے سے صاف

طور سے عیاں ہے پھر ہفتہ میں ایک بار تمام شہر کے لوگوں کا جمعہ کے لیے دوپہر کے وقت یکجا جمع ہونا مسلمانوں کو سپاہیانہ خصائص باہمی الفت و دستگیری کا خوگر بنا دیتا ہے۔

(۱۰) تمام عبادات کا مقصد اصلاح اخلاق اور روح کی بیداری اور دائمی تنبہ ہے۔ نماز ہی اس فرض کو پوری طرح ادا کر سکتی ہے، روزہ، زکوۃ حج اوّل تو ہر شخص پر فرض نہیں پھر روزہ اور زکوۃ کا موقع سال میں صرف ایکبار اور حج کا عمر بھر میں ایک بار آتا ہے اس لیے یہ نفس کی دائمی بیداری کا ذریعہ نہیں ہو سکتے۔ مگر نماز سے پانچ وقت روزانہ ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے اور اسکے شرائط و ارکان ایسے ہیں جو نفس میں اثر پذیری کی قابلیت پیدا کر کے اس کو ہر وقت ہوشیار کرتے رہتے ہیں۔

(۱۱) نماز باہمی الفت و محبت پیدا کرتی ہے۔ محلہ کے تمام مسلمانوں کا یکجا جمع ہو کر پانچ وقت نماز ادا کرنا ان میں سے بیگانگی کو دور کر دیتا ہے نماز کے اس وصف کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے فرمایا

"خدا سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو (یعنی) انمیں سے نہ بنو جنھوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور متفرق جتھے ہو گئے"

اس سے معلوم ہوا کہ نماز جتھے بندی سے روکتی ہے۔

(۱۲) نماز باہمی غمخواری کا ذریعہ ہے جب امیر و غریب یکجا جمع ہو کر نماز ادا کریں گے تو غریبوں کو دیکھ کر مالداروں میں جذبہ فیاضی پیدا ہوگا، ایک کو دوسرے کے درد کی خبر ہوگی۔ یہی چیز تھی کہ اکثر صحابہ اصحاب صُفّہ کو نماز سے فارغ اپنے گھر لاتے اور کھانا کھلاتے تھے۔

(۱۳) نماز صحیح قسم کا جذبۂ اجتماعیت پیدا کرتی ہے جو ایک فطری تقاضا ہے۔ مذہبی قیود سے آزاد قومیں کلبوں، کانفرنسوں اور دوسرے جلسوں جلوسوں اور میلوں ٹھیلوں سے اجتماعیت کا مظاہرہ کرتی ہیں جن میں فائدہ سے زیادہ نقصانات مثلاً رنگ رلیاں، رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، بدکاری وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اسلام نے اسی لیے روزانہ کی عام باجماعت نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو بار عید کی نمازیں مقرر کیں تاکہ قلبی انسانی یہ فطری پیاس (اجتماعیت کا شوق) بھی بجھ جائے اور مشرکانہ بدعتوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی تحفظ رہے۔ حج کا عالمگیر اجتماع علاوہ اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے اپنے اندر ذکر خدا اور توبۂ و انابت کے وہ مشاغل رکھتا ہے، جن کی بنیاد اخلاص عمل اور پاکیزگی خیال پر ہے۔

(۱۴) تفنن اور تجدد جو فطرت انسانی کا مطالبہ ہے روزانہ پانچ بار مختلف اوقات میں نماز کے اقامت سے اس میں بڑی مدد ملتی ہے

یعنی صبح سے کام کیا اور ظہر پر آ کر چھوڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی اور وہ عصر پر ختم ہو گئی پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد خانگی مصروفیات رہیں جن کی انتہا عشا پر ہو گئی، اب نیند آ گئی صبح کو اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا ورنہ مسلسل بڑے سے بڑے مفید کام پر لگے رہنا بھی دو بھر ہو جاتا۔ گویا یہ ایک روحانی انٹرول (وقفہ) ہے کہ انسان جو ایک ہی قسم کے بوجھ میں دبا جا رہا تھا، چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست سے ہلکا ہو جاتا ہے اور اپنے اندر کام کرنے کے لیے نئی قوت پانے لگتا ہے

(۱۵) انسان کی عملی کامیابی استقلال پر اور استقلال عادات و اخلاق کی استواری پر موقوف ہے پس جو کام اخلاق کی تربیت کرتے ہوں انھیں روزانہ بلکہ دن میں کئی بار ہونا چاہیے نماز ایسا ہی فریضہ ہے۔ چونکہ اس کے بجالانے کے لیے مواظبت اور استقلال شرط ہے اس لیے نماز سے بڑھ کر اصلاح اخلاق کا اور کوئی ذریعہ نہیں اسی لیے حضورؐ نے فرمایا "محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ کم ہو"۔

(۱۶) قومی زندگی کیلئے منظم جماعت ضروری ہے۔ اسلام میں نماز باجماعت اسی نظم جماعت عملی شال ہے یعنی جس طرح نماز کی درستی کے لیے صف بندی، اور نظام جماعت کی ضرورت ہے۔ اسی

طرح پوری قوم کے لیے باہمی تعاون اور میل جول اور ہمدردی کی حاجت ہے نماز کی صفوں کی درستی پر زور دیتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا: "جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے"

(۱۷) نماز با جماعت مسلمانوں میں مساوات کا درس ہے جہاں امیر، غریب، کالے گورے، عربی عجمی اور شاہ و گدا کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اسلام میں اس برادرانہ مساوات کی مشق دن میں پانچ دفعہ کرائی جاتی ہے کیا مسلمانوں کی طرح معاشرتی جمہوریت کی ایسی درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

(۱۸) جماعت کی سلامتی مرکزی اطاعت یعنی قابل اتباع امام کے بغیر ناممکن ہے، نماز با جماعت میں یہی رمز ہے یعنی جس طرح ان کی عبادت کا ایک امام ہے اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیئے۔

اطاعت امام کے لیے قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت اور امام میں اخلاق صالحہ کا وجود درکار ہوتا ہے نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے گویا ایک حرکت دائمی ہے جو قوم کے اعضا کو ہر وقت اطاعت گذاری کے لیے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نماز کے لیے امام میں جن خاص اوصاف کی ضرورت ہے ان کے احتساب کی طرف ہر وقت قوم کی نگاہ لگی رہتی ہے۔

(۱۹) نماز کی امامت کے لیے معیار فضیلت صرف علم وفضل اور تقوی ہے اس لیے امامت کا درجہ ہر مسلمان جن میں یہ اوصاف ہوں حاصل کر سکتا ہے اس سے لوگوں میں علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

(۲۰) نماز روزانہ کی مجلس عمومی ہے، چنانچہ حضورؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں کسی اہم واقعہ یا سیاسی مسئلہ کے پیش آنے الصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ (نماز جمع کرنے والی ہے) کی ندا کی جاتی تھی۔ اور سب مسلمان جمع ہو کر اس امر اہم کے متعلق مشورہ کرتے تھے۔

اس تفصیلات نے ثابت کر دیا کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور مذہبی، اجتماعی، تمدنی، سیاسی اور اخلاقی مقاصد کا آئینہ دار ہے اور مسجد قومی و مذہبی اجتماعات کا مرکز۔ جہاں اجتماعات کا آغاز خطبات صدارت کے بجائے نماز سے ہوتا تھا، مسجد ہی مسلمانوں کا دارالامارۃ، دارالشوری اور بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا اور وہی درسگاہ اور معبد تھا۔

نماز مسلمانوں کو نظم جماعت، اطاعت پذیری اور وحدت قوت کا سبق روزانہ پانچ بار سکھاتی ہے جس پر اجتماعی ترقی کی بنیاد ہے جس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں اور نہ اسکی اجتماعی وحدت اور زندگی کا کوئی نصب العین قرار پا سکتا ہے اسی لیے

حضورؐ نے فرمایا "ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کا کام کیا۔"

عرب کی روحانی کایا پلٹ

رسول اللہ کی تعلیم نے عرب کی کایا پلٹ دی جو خدا کی پرستش، اس کی حمد و ثنا سے یکسر ناآشنا تھے اب عبادت الٰہی، اخلاص عمل، لذت خداطلبی کے گردیدہ ہو گئے، وہ عرب جن کی پہلی حالت یہ تھی کہ

وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا — وہ خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

اب ان کی مشغولیت ذکر الٰہی اس درجہ بڑھ گئی کہ خود قرآن نے الفاظ ذیل میں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ — ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا مشغلہ یادِ خدا سے غافل نہیں کرتا

سورۃ سجدہ، مرسلات، فتح، زمر اور انفال و حج میں بھی انکی مشغولیت عبادات اور خشیہ و خوف خداوندی کے بیان میں متعدد آیات نازل ہوئیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور کی تعلیم نے عرب کی

روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب برپا کردیا قتادہؓ کہتے ہیں "صحابہ خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب کوئی خدا کا معاملہ آتا تھا تو یہ شغل ان کو یاد الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا" صحابہؓ تمامتر راتیں یاد خدا میں جاگ کر گذارتے تھے" بلکہ بعض صحابہ راتوں کو کسی مخفی گوشہ میں جمع ہو کر یاد خدا کرتے اور حضورؐ ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن نے اس نظارہ کی کیفیت ان الفاظ میں ادا کی ہے:" اور اس غالب، رحم والے (خدا) پر بھروسہ کر جو رات کو تجھے دیکھتا ہے جب تو (نماز کو) اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان تیرا گھومنا بھی دیکھتا ہے"

صحابہؓ سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں نماز کو نہ چھوڑتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ نے ایک صحابیؓ کو کسی پر خطر کام بھیجا، جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، ان کو خطرہ ہوا کہ اگر ٹھہر کر نماز عصر پڑھی جائے تو کام کا موقع نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو گی اس مشکل کا حال انہوں نے اس طرح کیا کہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے تھے اور چلتے جاتے تھے۔

نماز میں ان پر عجب رقت طاری ہو جاتی تھی، چنانچہ نماز میں حضرت ابوبکرؓ پر ایسی رقت طاری ہوتی تھی کہ کافر عورتوں اور بچوں پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا۔ محویت کا یہ عالم ہو جاتا تھا کہ حضرت انسؓ

کے قیام اور سجدہ میں دیر تک رہنے کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگتے تھے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔

ایک دفعہ دو صحابی ایک پہاڑی پہ پہرہ کے لیے مقرر ہوئے ان میں ایک سو گئے اور دوسرے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے دشمن نے تاک کر تیر مارا جو بدن میں پیوست ہو گیا مگر نماز میں استغراق کا وہی حال رہا فارغ ہو کر ساتھی کو جگایا، ساتھی نے کہا کہ مجھے اسی وقت کیوں نہ جگا دیا تھا تو جواب دیا میں نے ایک پیاری سورت شروع کر رکھی تھی پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت فاروق اعظم امامت کرتے ہوئے نماز فجر میں ایک شقی کے خنجر سے زخمی ہو کر گر جاتے ہیں، لیکن نماز کی صفیں بدستور قائم رہتی ہیں۔ حضرت حضرت عبدالرحمن بن عوف نماز پوری کراتے ہیں جب دوگانۂ صبح ادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔

امام مظلوم حسین رضؓ بن علی رضؓ کربلا کے میدان میں دشمنوں کے نرغہ میں ہیں۔ اتنے میں ظہر کا وقت ہو جاتا ہے۔ آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ" وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں"

نماز میں خشوع و خضوع صحابہ رضؓ کو اسقدر عزیز تھا کہ اگر کوئی دوسری عزیز سے عزیز چیز اس میں حائل ہوتی تو اس کو اس ذوق روحانی پر قربان کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت طلحہ رضؓ اپنے باغ میں مصروف

نماز پڑھتے ایک خوشنما چڑیا کا چہچہانا سُن کر دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل میں کہا کہ یہ فتنہ اس باغ نے برپا کیا پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا اور کہا یا رسول اللہ یہ باغ راہِ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح عہد عثمان رضؓ میں ایک صحابی کو اپنے باغ کی سرسبزی و شادابی کو دیکھ کر نماز سے غافل ہو جانے کا واقعہ پیش آیا حضرت عثمان رضؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کیا، میں راہِ خدا میں دیتا ہوں، حضرت عثمانؓ نے بیت المال کی طرف سے اس کو فروخت کیا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہُوا۔

سوالات

(۱) ثابت کرو کہ اسلامی نماز میں بہت سے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے ہیں۔

(۲) اسلامی عبادتوں یعنی روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ میں سے کونسی عبادت عبادات کے عام مقصد یعنی اصلاح اخلاق اور بیداری روح کو سب سے زیادہ کامل تر صورت میں پورا کرتی ہے۔

(۳) بتاؤ کہ نماز کس طرح اجتماعیت کے جذبہ کی تسکین کا سبب

بنتی ہے۔

(۴) نماز باجماعت کی مصلحتوں پر کلام کرو۔

(۵) واضح کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے روحانی طور پر عرب کی کایا پلٹ دی۔

زکوٰۃ

قران نے نماز کے متصل ہی زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ فرمایا۔

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ — اور زکوٰۃ دو

زکوٰۃ کی حقیقت اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جس کا تعلق خالق و مخلوق کے رابطہ سے ہے، نیز اس کا بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جو کبھی عام مالی و جسمانی امداد پر بولا جاتا ہے، فقہی اصطلاح میں زکوٰۃ اس حق واجب کا نام ہے جو ایک مسلمان کے مال کی ایک خاص مقدار پر عائد ہوتا ہے۔

زکوٰۃ اور گذشتہ مذاہب تمام آسمانی مذاہب میں زکوٰۃ کا حکم ہے لیکن اُن کے ماننے والوں نے اس کو ایسا بھلایا کہ گویا ہے ہی نہیں۔ قران نے بنی اسرائیل سے جو خدا کے

عہد کا ذکر کیا ہے اُس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔ فرمایا

"(ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ) نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو"

حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر میں ہے "اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا"

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں "اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں دسواں حصہ اور بیس سال یا اس سے زیادہ عمر والے ہر شخص پر آدھا مثقال دینا واجب تھا یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں رکھی جاتی تھی، اسی مد سے حاجیوں کی مہمانی اور عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر کھلایا جاتا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ نے بھی شریعت موسوی کے ان ظاہری احکام میں تبدیلی نہیں کی بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زور دیا انجیل کے اکیسویں باب کی پہلی آیت ہے۔

"اگر کوئی دولتمند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اُس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے"۔

توراۃ میں زیادہ تر پیداوار اور جانوروں کی زکوٰۃ کا ذکر ہے کیونکہ اس وقت چاندی سونے کے سکوں کی قلت تھی اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی۔ نیز نہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کی مدت کی تصریح ہے اور نہ اس کے مصارف کی وضاحت ہے۔
غرض وجہ کچھ ہو مگر حالت یہ تھی کہ یہود زکوٰۃ کو بھلا بیٹھے تھے، عیسوی مذہب میں سب کچھ لٹا دینے کا حکم تھا جو ہر ایک کے لیے نہ موزوں ہوسکتا ہے اور نہ قابل عمل ان کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی خیرات کے احکام موجود تھے مگر کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں تھا۔

زکوٰۃ اور اسلام

اسلام نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا۔ کاروبار کا معیار چونکہ سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے اس لیے اُس نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد قرار دی۔ دولت کے سرچشمے تین قرار دیے، سونا[1] چاندی، جانور[2] اور پیداوار[3]۔ سونے چاندی میں چالیسواں حصہ، پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا۔ جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی خاص خاص تعداد اور قدر و قیمت کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں پھر زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعین کی اور اُس کی تحصیل و وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

اہمیت زکوٰۃ

قرآن میں نماز کے بعد ہی جس فرض کے ادا کرنے

کا حکم ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ نماز حقوق الہٰی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے اسلام میں ان دونوں کا یکساں لحاظ رکھا گیا۔ بارگاہ نبوی میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام پوچھے تو ہمیشہ آپؐ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے چنانچہ وفد عبدالقیس نے ۵ھ میں حاضر ہو کر جب حضورؐ نے تعلیمات اسلام معلوم کیں تو آپ نے اعمال میں نماز کے بعد زکوٰۃ کو جگہ دی۔

اسی طرح حضورؐ کے صحابہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ حضور کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے زکوٰۃ سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے خلاف تلوار کھینچ لی، فرمایا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے لڑوں گا۔ کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے خدا کی قسم جو رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا"

اسلام میں نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس کی تنظیمی زندگی دو بنیادوں پر قائم ہے ایک روحانی ہے اور دوسری مادی، روحانی نظام نماز با جماعت سے وابستہ ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو اسی شریعت محمدی نے ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی اہمیت پر زور دیا ہے۔ زکوٰۃ کے لیے بیت المال کی وہی حیثیت ہے جو نماز کے لیے جماعت کی یہی سبب ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ

کے سامنے بعض قبائل نے بطور خود زکوٰۃ صرف کرنے کی تجویز رکھی تو آپ نے قبول نہیں کی کیونکہ اگر یہ بات مان لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا شیرازہ اُسی وقت منتشر ہو جاتا۔

زکوٰۃ کی ابتدا اور تدریجی تکمیل

زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب تو ابتدائے اسلام سے شروع ہوئی مگر رفتہ رفتہ اس کا پورا انتظام فتح مکہ کے بعد قائم ہوا گو اس کی فرضیت ۸ھ میں ہوئی مگر اس سے پہلے بھی زکوٰۃ کا لفظ مطلق خیرات کے معنی میں آیا ہے، نصاب، سال کا دور اور دوسری خصوصیتوں کی تعیین رفتہ رفتہ بعد میں ہوئی۔ رسول اللہؐ کی تعلیمات کا خلاصہ دو لفظ ہیں۔ خدا کا حق اور بندوں کا حق، نماز پہلے حق کا مظہر ہے اور زکوٰۃ دوسرے کا۔

سورۂ مدثر جو ابتدائے وحی کی سورتوں میں سے ہے اس میں وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (اپنے رب کی بڑائی بیان کر) سے جہاں نماز کی کی تخم ریزی ہوئی وہاں اسی کے متصل وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (اور بدلہ بہت چاہنے کے لیے کسی پر احسان نہ کر) سے زکوٰۃ کا بیج بویا گیا ہے پھر جب سورۂ مزمل اتری تو اس میں صاف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا حکم ہے۔

چنانچہ بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ نے نجاشی شاہ حبشہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے حضورؐ کی تعلیمات پر

روشنی ڈالی ہے تو کہا "وہ پیغمبر ہم کو سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں"

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ عام مالی امداد کے معنی میں ابتدائے اسلام میں موجود تھی اور اس وقت کی حالت اور مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی و شکستہ حالی کے پیش نظر اتنا بھی بہت تھا کہ وہ کسی یتیم اور مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ چنانچہ اس وقت قریش پر جنھوں نے رسول اللہ کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے پر یہ عتاب آیا۔

"وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کو کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا"

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اخلاص اور باہمی ہمدردی کی تعریف خدا نے ان الفاظ میں فرمائی۔

"اور (وہ حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تم کو صرف خدا کے لیے کھلاتے ہیں۔ تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔

البتہ جب مدینہ میں مسلمانوں کو اطمینان نصیب ہوا تو روزہ کے ساتھ ساتھ صدقۃ الفطر واجب ہوا یعنی عید کے دن سوا سیر غلہ راہِ خدا میں دینا تاکہ محتاج اور غریب لوگ بھی اس دن کو پیٹ بھر کر مسرت و خوشی سے گذاریں۔ اس کے بعد عام صدقات پر زور دیا گیا، فرمایا۔

"وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں (اے پیغمبر) کہدو کہ جو ضرورت سے بچ جائے (وہ خیرات کردو)"

یہ زکوٰۃ کی تعیین کا پہلا قدم تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب فتوحات کے ہونے سے زمینیں اور جاگیریں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ تجارت شروع ہوئی تو حکم ہوا۔

"اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم زمین سے تمھارے لیے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات کرو"

ان احکام کے بعد صحابہؓ راہ خدا میں کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بیقرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب حضور نے فرمایا کہ صدقہ دینا ہر مسلمان پر فرض ہے تو نادار صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کریں فرمایا "وہ محنت مزدوری کرکے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے" عرض کی اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کیا کرے فرمایا وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، عرض کی اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا کہ "وہ نیکی کا کام کرے اور بُرائی سے بچے"۔ حضورؐ نے ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہؓ بازار جاکر بوجھ اٹھاتے تھے اور جو کچھ ملتا اس میں سے راہ خدا میں صرف کرتے تھے۔

لیکن ابھی تک زکوٰۃ کا مکمل نظام قائم نہ تھا، ۸ ؁ھ میں فتح مکہ کے بعد ۹ ؁ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے

باقاعدہ بیت المال قائم ہوا اور وصولیابی کے لیے محصّلین مقرر ہوئے

زکوٰۃ کی دوسری قدریں

تعین مدت اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت میں بڑی بے نظمی تھی توراۃ کی رو سے عُشر یعنی دسویں حصہ کا تقرر تین سال میں ایک بار تھا۔ انجیل میں کوئی مدت ہی مقرر نہ تھی اسلام نے دنیا کے کاروبار کے سالانہ آمدنی کے معیار کے پیش نظر ایک سال کی مدت مقرر کی تاکہ نہ تو اتنی قریب مدت ہو کہ لوگ گھبرا جائیں اور نہ اسقدر طویل کہ غربا اور فقرا کو امداد کے لیے لمبی مدت کا انتظار کرنا پڑے۔

سالانہ مدت اس وجہ سے بھی مناسب ہے کہ زمین کی پیداوار اور فصول کا دور ایک سال میں پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے صنعتی کاروبار، ذرائع اور پورے سال کی آمد و خرچ کا نفع و نقصان کا نظام درست ہو جاتا ہے، زمیندار، تاجر اور صناع ہر ایک اپنی آمدنی کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ یعنی اس سالانہ طبعی اصول کو اسلام نے ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلہ میں پیشِ نظر رکھا ہے جس کا اشارہ

کھلے الفاظ میں قرآن میں موجود ہے فرمایا۔

"مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہے (اُسی دن سے) جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔"

مقدار زکوٰۃ تورات کی رُو سے ہر پیداوار میں دسواں حصہ اور نقد میں برابر وغریب پر آدھا مثقال فرض معلوم ہوتا ہے لیکن زمینوں کی بارانی اور نہری ہونے، محنت کی کمی و زیادتی کے باعث نقد دولت کے مختلف اصناف اور لوگوں کے مختلف احوال کے پیش نظر سب کا حال یکساں نہیں ہو سکتا۔ انجیل نے بھی اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا بلکہ راہِ خدا میں سب کچھ لٹا دینے کا حکم دیا، جو اقتصادی لحاظ سے معاشرہ کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے علم الاقتصاد کے صحیح اصول کی بنا پر ہر ایک کے لیے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی، تورات کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین دونوں کو اس طرح جمع کیا کہ ہر شخص راہ خدا میں اپنا سارا مال یا نصف یا جتنا چاہے دے سکتا ہے۔ اس کا نام "انفاق" رکھا اس کو فرض نہیں قرار دیا، لیکن اسی کے ساتھ ایک خاص حصہ امرا کی دولت میں سے غربا کے لیے سالانہ فرض قرار دے دیا اور اس کا نام زکوٰۃ رکھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت ربانی کے تحت مختلف

اجناس پر زکوٰۃ کی مختلف شرحیں مقرر فرمائیں اور فرمانوں کے ذریعہ عمال حکومت کے پاس بھجوا دیں۔

ظاہر ہے جس آمدنی کے لیے محنت و سرمایہ زیادہ درکار ہو اس میں زکوٰۃ کم ہونی چاہیے اور جن میں محنت و سرمایہ کم درکار ہو اس میں زکوٰۃ زیادہ ہونی چاہیے، لیکن عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار مال غنیمت کا چوتھ (مال کا چوتھائی حصہ) وصول کیا کرتے تھے، ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ کو رواج دیا تھا۔ مگر اسلام نے محکوموں اور سپاہیوں کی رعایت سے اس میں کمی کر کے خمس (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کا قرار دیا جو رسولؐ اور ان کے نائب ذاتی مصارف، اہل و عیال کے نفقہ اور عام نادار مسلمانوں کی امداد میں صرف کر سکیں۔

پس مال غنیمت کی زکوٰۃ خمس ہے قرآن میں ہے

"اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں کے لیے اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے"

چونکہ مال غنیمت جہاد میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے اور یہ وہ سرمایہ ہے جو کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آجاتا ہے۔ اس لیے اس میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا حق قرار دیا گیا اسی اصول کے ماتحت اگر کہیں دفینہ مل جائے جسے "رکاز" کہتے ہیں تو اس میں

بھی پانچواں حصہ بیت المال کا حق قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد محنت و سرمایہ سے پیدا ہونے والی چیز پیداوار ہے، پھر دوسری قسم کا مال، اسلام نے پیداوار میں مختلف جنسوں پر مختلف شرحِ زکوٰۃ مقرر کی جو چیزیں جلد بگڑ جاتی ہیں۔ مثلاً سبزی ترکاری اس پر کوئی زکوٰۃ معین نہیں کی دوسری قسم کے اموال میں سے وہ مال جن میں نشوونما نہیں ہوتا مثلاً آلات مکان لباس، اسباب، سواری کے جانور، قیمتی پتھر، ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی۔ نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں۔ زمین^۱۔ جانور^۲۔ سونا^۳ چاندی اور تجارتی^۴ مال ان چاروں پر زکوٰۃ مقرر کی گئی۔

زمین

اس کی دو قسمیں لی گئیں ایک وہ جس میں بونے جوتنے کے علاوہ کاشتکار کو اور کوئی تردد نہیں پڑتا خود بارش سے یا زمین کی تری اور شبنم سے سیراب ہوتی ہیں۔ اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت (غنیمت و رکاز) کی رو سے آدھی زکوٰۃ یعنی دسواں حصہ مقرر کیا دوسری^۲ نہر یا کنوئیں سے سیراب کی جانے والی زمین اس میں اس کا آدھا یعنی بیسواں حصہ مقرر ہوا۔

نقد

سونا چاندی جس کی حفاظت، نشوونما اور افزائش کے لیے انسان کو شب و روز محنت کرنی پڑتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری اور نقصان وغیرہ کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس

پر زمین کی دوسری قسم سے بھی نصف یعنی چالیسواں حصّہ زکوٰۃ کا مقرر کیا گیا۔

تجارتی مال تجارتی مال کی قیمت اور نفع و نقصان کا اندازہ نقد چاندی سونے سے لگتا ہے نیز اس کے کاروبار میں زمینی پیداوار کے مقابلہ میں زیادہ محنت، سفر اور مصارف سفر، اور بے وطن ہو کر گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک پھرنا پڑتا ہے جب جاکر نقدی ہاتھ آتی ہے۔ کسان تو اپنی پیداوار تاجر کے ہاتھ فروخت کر کے ایک دم نقد قیمت وصول کر لیتا ہے پھر اُس کو شہری زندگی سے دور رہنے کی وجہ سے قومی ضروریات، دینی خدمات اور دیگر مستحقین کی امداد میں خرچ کرنے سے عموماً بےفکری رہتی ہے، جن کو عموماً تاجر نقد صورت میں پورا کیا کرتے ہیں۔ اس بنا پر بھی ضرورت تھی کہ نقد اور تجارت کی شرح زکوٰۃ پیداوار سے کم رکھی جائے۔

اقتصادی نکتہ خُمس میں امامت و حکومت کے تمام ذاتی اور قومی مصارف شامل ہیں۔ اس لیے وہ کل کا ۱/۵ مقرر ہوا اور زکوٰۃ متعارف کے مصارف میں کل آٹھ مصارف ہیں اس لیے اس کی شرح مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ یعنی ۱/۴۰ مقرر ہوا۔

غرض یہ کل شرحیں ۱/۵، ۱/۱۰، ۱/۲۰، ۱/۴۰ ایک دوسرے کا نصف ہوتی چلی گئی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم و تحدید

اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانور تورات میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ کا تھا، لیکن یہ حکم نہ جانوروں کی نسلی افزائش اور مدت افزائش کے مختلف ہونے سے مطابقت رکھتا تھا اور نہ جانوروں کی ہر تعداد پر دسواں حصہ جو ایک قدر مشترک ہے چسپاں ہو سکتا تھا اس لیے ضرورت جانوروں کی تعداد کا تعین کر کے ان پر زکوٰۃ متعین کرنے کی ضرورت تھی اور ساتھ نسل اور افزائش نسل کے مختلف مدارج کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا، اسلام نے یہ نقص پورا کر دیا کم نسل یا بے نسل جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ[1] کر دیا، مثلاً خچر، سواری کے گھوڑے یا ہاتھی ان پر کوئی[2] زکوٰۃ نہیں، دوسرے جانوروں کی مالیت اور کیفیت افزائش نسل کے لحاظ حسب ذیل شرح معین ہوئی۔ جس کے متعلق حضورؐ نے فرامین لکھوا کر عمّال کو بھجوا دیے تھے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں
"	۵ سے ۹ تک	ایک بکری
"	۱۰ سے ۱۴ تک	دو[3] بکری
"	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں
"	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
"	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایکسال کا بچہ

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دو سال کا بچہ
"	۴۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سال کا بچہ
"	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ
"	۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے
"	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے
"	۱۲۰ سے ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ
"	اور ہر پچاس پر	تین سال کا بچہ
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں
"	۴۰ سے ۱۲۰ تک	ایک بکری
"	۱۲۱ سے ۲۰۰ تک	دو بکریاں
"	۲۰۱ سے ۳۰۰ تک	تین بکریاں
"	پھر ہر سو (۱۰۰) پر	ایک ایک بکری
گائے، بیل اور بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں
"	۳۰ پر	دو سالہ بچھڑا
"	۴۰ پر	تین سال کا بچھڑا
"	۶۰ پر	دو سال کے دو بچھڑے

نرخ زکوٰۃ	تعداد	نام جانور
ایک تین سال اور ایک دو سال کا	۷۰ پر	گائے، بیل اور بھینس
تین سال کے دو ؎	۸۰ پر	〃
دو سال کے تین	۹۰ پر	〃
دو سال کے دو اور تین سال کا ایک ؎	۱۰۰ پر	〃

یعنی ہر تیس پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس پر ایک سہ سالہ

نصابِ زکوٰۃ دوسری شریعتوں میں نصاب کی تعیین نہ تھی، توراۃ میں امیر و غریب کا لحاظ کیے بغیر ہر ایک پر عشر اور آدھا مثقال واجب تھا، حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ "خداوند کے لیے نذر کرتے وقت امیر آدھے مثقال سے زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے۔"

لیکن شریعت محمدیؐ نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، غریبوں، مقروضوں، بے سرمایہ غلاموں یا اپنی آزادی کے لیے سرمایہ جمع کرنے والے غلاموں ان سب کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا۔ نیز کم سرمایہ والوں پر بھی باقاعدہ زکوٰۃ واجب نہیں وہ خود خیرات کریں یہ ان کی مرضی ہے۔ کم سرمایہ کا معیار مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو نصف مثقال ہی رکھا، لیکن اس پر واجب کیا جس کے پاس کم از کم بیس ؎ مثقال (۷ تولہ) سونا ہو اور چاندی کے اعتبار سے چونکہ ایک مثقال سونے

کی متوسط قیمت ۱۰ درم ہے، اس لیے چاندی کی کم از کم مقدار ۲۰۰ درم مقرر ہوئی۔
غرض دولت کی وہ کم مقدار جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق (ایک اونٹ کے قابل بوجھ) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
اونٹ	پانچ عدد "
گائے، بیل، بھینس	۳۰ عدد " "
بھیڑ بکری	۴۰ عدد " "
سونا	پانچ اوقیہ (بیس[۲] مثقال یعنی، تولہ) " "
چاندی	۲۰۰ درم " "

یہ تعداد جس پر زکوٰۃ واجب ہے گو جنسیت کے لحاظ مختلف ہے، مگر مالی لحاظ سے ایک ہی معیار پر ہے۔ کیونکہ ۵ وسق غلہ، دو سو[۲] درم چاندی اور پانچ اوقیہ (بیس مثقال سونا) درحقیقت مالی لحاظ سے یکساں ہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات

موسوی[۱] شریعت میں زکوٰۃ تین قسم کی تھی، اول[۲] نقد کی زکوٰۃ یہ جماعت کے خیمے یا بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے

سونے چاندی کے برتن اور سامان بنانے میں صرف کی جاتی تھی۔ دوم[2] خیرات، یہ کھیت کاٹتے یا پھل توڑتے وقت خوشوں میں کچھ دانے یا پھل چھوڑ دیے جاتے تھے، وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا اور سوم[3] یہ تھی ہر تیسرے برس پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ نکالا جائے، اس کا مصرف یہ تھا کہ دینے والا مع اہل وعیال بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھلائے اور موروثی کاہنوں اور خدّام بیت المقدس کو نام بنام تقسیم کرے۔

شریعت محمدیؐ نے مذہب کی حسب ذیل بڑی اصلاحات کیں۔

(۱) عبادت کو بندہ اور خدا کا بلا واسطہ تعلق قرار دیا اس بنا پر کاہنوں اور مجاوروں کی ضرورت جاتی رہی۔

(۲) عبادت میں سادگی پیدا کر دی اس لیے نمائشی چیزوں، سونے چاندی کے برتنوں وغیرہ کی ضرورت نہ رہی۔

(۳) حج انہی پر واجب کیا جن کے پاس زادراہ ہو اس لیے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی۔

(۴) زکوٰۃ کو خود مالک کی ضروریات میں صرف کرنا ممنوع قرار دیا ورنہ اس میں ایثار کیا ہوتا

(۵) مذکورہ بالا امور کی تنسیخ سے جو رقمیں بچیں وہ غربا کا حق قرار دیا۔

(۶) گذشتہ شریعتوں کے طرز عمل کے مقابلہ پر زکوٰۃ خود مستحقین کو حوالہ کر دینے کی اجازت دی تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات

میں صرف کریں۔

(۷) نقد کے سلسلہ میں جو نصف مثقال کی زکوٰۃ تھی وہ بیت المقدس کے خرچ کے لیے مخصوص تھی شریعت محمدیؐ نے اس کو بھی مستحقین کے ہاتھ میں دے دیا۔

(۸) غلہ کی زکوٰۃ تمام کی تمام بیت المقدس میں پکوا کر غربا کو کھلائی جاتی تھی جو شاید بنی اسرائیل کی چھوٹی سی قوم کے لیے موزوں ہو، مگر اسلام کی عالمگیر قوم کے لیے ہرگز موزوں نہ تھی، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین کو دیدی جائے۔

(۹) بعض منافقین وغیرہ صدقات کے لالچ میں نہ ملنے پر ناخوش ہوتے اور طعن و طنز کرنے لگتے تھے، اس لیے اسلام نے زکوٰۃ کے تمام مستحق مصارف کی تعیین کر دی تاکہ ان کا منہ بند ہو اور مفت خوری کی عادت چھوٹے۔

(۱۰) صحیح مصارف میں زکوٰۃ صرف ہونے کے لیے غیر مستحق کو زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا، اور بتا دیا کہ دینے والا اگر جان بوجھ کر کسی غیر مستحق کو زکوٰۃ دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔

(۱۱) حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنی لاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا، مگر ایسا کرنا چونکہ خود شارع کے حق میں اس بدگمانی کی وجہ ہو سکتی تھی، کہ وہ اپنے اہل خاندان کو لیے دائمی آمدنی کا خواہشمند ہے۔ اس لیے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے لیے قیامت تک کے لیے زکوٰۃ کی ہر مد کو قطعی حرام قرار دے دیا تاکہ اس بدگمانی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

(۱۲) قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف (مستحقین) قرار دیے گئے، فرمایا۔

"زکوٰۃ تو ان غریبوں[۱]، مسکینوں[۲] اور زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں[۳] اور اُن لوگوں کے لیے ہے جن[۴] کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن[۵] چھڑانے میں (غلاموں کی آزادی میں) اور جو تاوان[۶] بھریں ان میں اور خدا کی راہ[۷] میں (یعنی حاجتمندوں میں) اور مسافر[۸] کے بارے میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے"

فقرا میں ان کو ترجیح دی جو شریف اور خود دار ہونے کی وجہ سے باوجود حاجتمند ہونے کے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے

دو ضرورت مندوں میں ترجیح چونکہ حقوق باہمی تعلقات و روابط پر مبنی ہیں۔ اس لیے اسلام سے پیشتر کا یہ خیال کہ قرابت کے مقابلہ میں غیر قرابت دار کو دینا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ قرابت دار کو دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت و خود غرضی پائی جاتی ہے، صحیح نہیں ورنہ رشتہ داری کے فطری تعلقات

لغو ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر دنیا میں ہر ایک انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس لیے قرابت داروں کو ترجیح دینے میں دوسرے غریبوں کے حق مارے جانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس طرح ہر شخص اپنے رشتہ دار کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مستحقین میں ترجیح کی وجہ دو چیزیں ہیں۔ ایک دینے والے سے نسبت کا قرب و بعد اور دوسری خود حاجتمند کی ضرورت کی کمی و بیشی۔ اس لیے قرابت دار کو ترجیح دینے کا یہ مطلب نہیں کہ خواہ کتنی معمولی حاجت رکھتا ہو تو اُسے بڑے سے بڑے غیر رشتہ دار حاجتمند پر ترجیح دی جائے بلکہ درحقیقت ترجیح کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ دو برابر کے حاجتمند ہوں اور ان میں ایک قرابت دار یا ہمسایہ یا دوست ہو تو زکوٰۃ کا زیادہ مستحق یہ ہوگا۔

بے حیائی سے بھیک مانگنے والوں پر ان کو ترجیح دی جائیگی جو باوجود ضرورت کے خود داری سے کام لے کر لوگوں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے "کہ مسکین درحقیقت وہ ہے جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے نہیں مانگتا"

تعیین مصارف سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہر شخص کو مانگنے کا حوصلہ نہ رہا جیسا کہ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں نے زکوٰۃ

کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضورؐ سے زکوٰۃ کے مال کی درخواست آپ نے فرمایا "اے شخص اللہ تعالےٰ نے زکوٰۃ کی تقسیم کا کسی انسان کو بلکہ پیغمبر کو بھی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصرف مقرر کر دیے ہیں"

زکوٰۃ کے آٹھ مصرف

ان آٹھ مصرفوں میں جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ ہر قسم کے اہل حاجت داخل ہیں۔ جو محنت[۱] مزدوری نہیں کر سکتے جیسے معذورین یا دین و ملت[۲] کی خدمت میں مصروف رہنے کی وجہ سے جو اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے جیسے مبلغین[۳]، مذہبی معلمین اور طالب علم یا وہ کم نصیب جو باوجود محنت کے روزی پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

امام کی طرف سے جو لوگ تحصیل زکوٰۃ پر مامور ہیں۔ اس میں وہ بھی والعاملین علیہا کے بموجب اپنی اجرت پا سکتے ہیں۔

تالیف[۴] قلب کے لیے نو مسلموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے اور اس پر جمائے رکھنے کے لیے بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

غلاموں[۵] کی گردن قید غلامی سے چھڑانے کے لیے یا مقروضوں کی گردن بار قرض سے آزاد کرنے کے زکوٰۃ صرف ہو سکتی ہے۔ قبائل میں صلح کرانے کیلئے کسی نے مالی[۶] ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے تو یہ ضمانت بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے اور اللہ[۷] کے راستہ

میں جو ایک عام وسیع مفہوم ہے، جس میں ہر کارِ خیر داخل ہے، اور مسافروں کی ذاتی امداد یا ان کے راحت رسانی سامان مہیا کرنے میں زکوٰۃ صرف ہو سکتی۔ یعنی اسلام کے عام محتاجوں اور معذوروں کی علاوہ جن کی امداد واقعی اہم اور ہر مذہب میں ضروری خیال کی جاتی ہے، چند ایسے مصارف بھی مقرر کیے جن کی اہمیت کو خاص طور سے اسلام نے ہی محسوس کیا۔ چنانچہ

(۱) غلامی کا انسداد انسانیت کی گردن سے غلامی کے بھاری زنجیر کو سب سے پہلے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، اُن کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید، زکوٰۃ کی مد کا ایک خاص حصہ ان کے لیے نامزد کر دیا تاکہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے اور انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہُوئی آزادی واپس مل جائے۔

(۲) مسافر گذشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات، سفر کے وسائل و ذرائع کی کمی، وسیع صحراؤں میں پیدل سفر کرنا۔ اہل و اقارب سے الگ ہو کر حوادث زمانہ کے سیلاب میں بہنا، اور آسائش کے سامان کا مفقود ہونا، ان سب باتوں کے پیشِ نظر ضرورت تھی، کہ ان کی راحت کا سامان کیا جائے۔ اس لیے زکوٰۃ میں سے ایک حصہ ان کی امداد کے لیے مقرر ہُوا۔

موجودہ عہد تمدن و ترقی میں سفر کی جو سہولتیں، سواری کی راحتیں، ہوٹلوں کی آسائشیں ہیں۔ عموماً اس سے مالدار طبقہ ہی فائدہ اُٹھا سکتا ہے، غریب کے لیے وہاں سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں ملتی لیکن جب ملک غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آئے، تو وہاں سراؤں، مسافر خانوں، کنوؤں وغیرہ کا ایسا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین سے کاشغر تک کے ایک ایک گاؤں میں بآرام و آسائش پہنچ جاتا تھا، آج بھی ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طریق سے واقف نہیں ہوئے ہیں۔ غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے۔

(۳) جماعتی کاموں کے اخراجات کا نظام

جماعتی کاموں کے لیے بھی سرمایہ درکار ہوتا ہے، کمزوروں کی مدد جماعتی تحفظ کے لیے مجاہدین کے مصارف، خدمت جماعت میں مصروف رہنے والوں کی کفالت، مقروضوں کی امداد، جماعتی کارکنوں کی تنخواہ اور جماعت کی مذہبی اور علمی خدمت کرنے والوں اور عاملین زکوٰۃ کے وظائف، ان سب باتوں کے لیے دولت کی ضرورت ہے اور زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایۂ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد و فوائد

زکوٰۃ کا مرکزی فائدہ روحانی برائیوں اور گناہ سے پاک و صاف ہونا ہے

جو خود زکوٰۃ کے لغوی معنی "پاکی اور صفائی" کے اندر مضمر ہے ۔ یہ تزکیہ اور پاکی نبوت کی ان عظیم الشان تین خصوصیتوں میں سے جن کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے۔

يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ — وہ نبی خدا کی آئتیں پڑھ کر انکو سناتا ہے
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ — اور انکو گناہوں سے پاک صاف کرتا ہے
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ — اور انکو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہی

تزکیہ

گناہ اور روحانی برائیوں کے دو سبب ہوتے ہیں۔ خدا[۱] سے خوف و رجا اور علاقہ محبت کا نہ ہونا، ماسوی[۲] اللہ سے محبت اور مال و اسباب دنیوی سے تعلق پہلے سبب کا ازالہ نماز سے اور دوسرے سبب کا زکوٰۃ سے ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ غزوہ تبوک میں بعض صحابہ رض کے باغ و بستان کی محبت میں شریک غزوہ نہ ہونے پر ان کی اصلاح حال کے لیے خدا نے حضور کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً — ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا — ان کو پاک وصاف بناؤ۔

سود اور صدقہ میں حد فاصل

قرآن نے سود اور صدقہ میں حد فاصل یہ قرار دی ہے "کہ اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے" اگرچہ بظاہر مشاہدہ اس کے برعکس ہے، مگر اس سے مراد اُخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کا فرق ہے، دوسرے یہ کہ صاحب خیر اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو سب

اس کی امداد و ہمدردی کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور سود خوار اگر کسی بلا میں مبتلا ہو تو کوئی انگلی تک نہیں ہلاتا۔

علاوہ ازیں سود خوار طماع و حریص ہوتا ہے اس کی نظر میں مال کی بڑی مقدار بھی حقیر ہے۔ اور صاحب خیر مستغنی اور قانع ہوتا ہے اس کے لیے مال کی تھوڑی مقدار بھی کافی ہے۔ اسی لیے حضور نے فرمایا " تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے"۔

عملاً امداد باہمی

یوں تو ہر مذہب نے غریبوں اور محتاجوں کی مدد کی تعلیم دی ہے۔ مگر محض خوش آیند الفاظ سے زندگی سے یہ تلخی دور نہیں ہو جاتی، دنیا کے پہلے اور آخری پیغمبر جنھوں نے اس طبقہ کے ساتھ عملی ہمدردی کا ثبوت دیا صرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنھوں نے خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی " خدایا مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر"۔

آپ کی نظر میں کسی کی غربت اس کی ذلت و رسوائی کے ہم معنی نہ تھی اور نہ کسی کی دولت اس کے وقار و عزت کے مرادف تھی بلکہ معیار فضیلت پرہیز گاری تھی۔ حضورؐ نے غربا کو یہ خوشخبری دے کر ان کی تشفی خاطر فرمائی " غریب (جن کو دولت کا حساب نہیں پڑے گا) دولت والوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے"

اسلام نے ان روحانی تسلیوں کے ساتھ باہمی ہمدردی کے لیے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں، ایک یہ کہ جسقدر جس سے ممکن ہو اپنی دولت سے غربا کی امداد کرے اس کا قرآنی نام انفاق ہے یہ اخلاقی خیرات ہے دوسری یہ کہ ہر مالدار پر جو مال کی ایک خاص مقدار کا مالک ہو سالانہ قانونی محصول عائد کیا اس کا نام زکوٰۃ ہے چنانچہ حضور نے معاذ بن جبلؓ کو نائب بنا کر یمن بھیجتے وقت توحید و نماز کے بعد جو حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے۔ جس کے متعلق فرمایا۔

تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِهِمْ وَ — وہ ان کے دولت مندوں سے لیکر
تُرَدُّ اِلٰی فُقَرَاءِهِمْ — ان کے غریبوں کو لوٹا دی جائے

عام صدقات کی ہدایات پر بھی صحابہؓ کا اس شدت سے عمل تھا کہ غیر مستطیع لوگ بھی مزدوری کر کے رقم حاصل کرتے اور غریب بھائیوں کی امداد میں صرف کرتے تھے۔ خدائے تعالےٰ نے یتیم اور سائل کی مانگ پوری کرنے کی تلقین فرمائی "تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑکا کر"

اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ احسان جتا کر اپنے احسان کو باطل نہ کرو۔

دولت مندی کی بیماری کا علاج دولت مندی کی بحث دنیا کے مذاہب میں ایک اہم بحث تصوّر کی جاتی ہے۔ یہودیت کے مانند بعض مذاہب اور بھی ہیں، جن میں

نہ دولت مندی کی تحقیر ہے اور نہ غربت کی ستائش۔ باقی دو مذہب عیسائیت اور بودھ مت ایسے ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر ہے اور اس کو نجات کے راستہ میں رکاوٹ قرار دیا ہے۔ انجیل میں ہے، ایک دولت مند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ پوچھا، تو انہوں نے سب کچھ بیچ کر محتاجوں کو دے ڈالنے کی تلقین کی اور دولت مند یہ سن کر غمگین ہو کر چلا گیا۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا، کہ دولت مند کے لیے آسمانی بادشاہت (نجات آخرت) میں داخل ہونا مشکل ہے۔ بودھ مت نے ترک دنیا کی تلقین کی اور لوگوں کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ دے دیا، لیکن پیغمبر اسلام نے ان دونوں طریقوں کی اصلاح کی کیونکہ دولت اگر بری چیز ہے تو اس کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہیں کہی جا سکتی اور اگر غربت بری ہے تو خود سب کچھ لٹا کر مفلس بن جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ درحقیقت دولت یا غربت بذات خود کوئی برائی یا اچھائی نہیں جہاں دولت بدکاریوں کا ذریعہ ہوتی ہے وہاں غربت بھی سب سے زیادہ جرائم کا سبب بنتی ہے، بلکہ نیکی کی صلاحیت و استطاعت کے لحاظ سے ایک نیک کردار متمول، ایک نیک کردار غریب سے بدرجہا زیادہ نیکی کرنے کے مواقع رکھتا ہے۔ اس لیے اسلام نے دولت کو خدا کی نعمت قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن نے اس کو "خیر" اور "فضل" کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

خود حضورؐ نے ایک صحابی کو مرتے وقت جبکہ وہ اپنا سارا مال راہِ خدا میں دینا چاہتے تھے۔ یہ فرمایا "تم اپنے اہل وعیال کو غنی چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں"۔

پس دولت بذات خود بُری چیز نہیں ہاں اس کا حد اعتدال سے زیادہ اور غلط طریقہ پر صرف کرنا بُرا ہے جس کے متعلق حضورؐ نے ایک تقریر میں فرمایا "دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے۔ لیکن جب بعض جانور حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر وبرکت کی چیز ان کی ہلاکت کا باعث ہو جاتی ہے لیکن حد اعتدال سے کھانے والا جانور اپنا پیٹ بھر کر دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر جگالی کر کے فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے، جو شخص صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو دولت اس کے لیے بہترین مددگار ہے۔ لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا"

اس سلسلہ میں اسلام کی تعلیمات نے ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی سب سے پہلے ممانعت کی جیسے دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، اور سود وغیرہ۔ سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی۔ صحیح طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی

کے لیے اُفتادہ زمینوں کو قابل پیداوار بنانے والوں کی (خواہ وُہ کوئی ہو) ملکیت قرار دیدیا، اس سلسلہ میں فرمایا "زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اُسی کی ہے"

ترکہ اور ورثہ کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنایا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کے بجائے پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی عام بخششوں مثلاً پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ کو جماعتی تصرف میں دیدیا۔ لڑائی میں دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو دولت مندوں کی بجائے غریبوں اور بےکسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی قرآن نے بیان کر دی، فرمایا

"بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کے ہاتھ لگادے وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں، غریبوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ اُلٹ پھیر سے تم میں سے صرف دولت مندوں کے لین دین میں (منحصر ہوکر) نہ رہ جائے"

اس کے بعد دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو آخرت میں بڑی سے بڑی سزا مستوجب قرار دیا۔ اور جو اس مرض سے پاک ہو اس کو فلاح اُخروی کی بشارت دی اور بخل کا وبال خود بخیل پر

ڈالا فرمایا۔

"اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو"

اس آیت سے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جسے انسان اپنا مال سمجھتا ہے وہ درحقیقت خدا کا ہے اور انسان خود خدا کا دست نگر ہے انسان کا یہ تصور کہ "یہ مال میرا ہے" یہ انانیت ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے جسے اس آیت نے کھود کر پھینک دیا۔ پھر خدا نے ان مجازی مالکوں سے قیامت کو حساب کتاب لینے کا پہلے سے اعلان کر دیا، فرمایا: "پھر اُس دن تم سے تمھاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا" ان لوگوں کو جو اپنے دولت کو سرمایۂ نجات تصور کرتے ہیں۔ تنبیہہ کی فرمایا۔

"بربادی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب جوئی کرتا ہو، جو مال کو سَینت سَینت کر اور اس کو گِن گِن کر رکھتا ہو وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسکے ساتھ سدا رہے گا ہرگز نہیں،"

سونا چاندی زمین میں گاڑ گاڑ کر رکھنے والوں کو خطاب کیا۔

"وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی "خوشخبری" دیدو۔"

اس آیت کا اثر یہ ہُوا کہ صحابہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے، ایک جو سب

کچھ خدا کی راہ میں دے ڈالنے کا قائل تھا دوسرا وہ جو مال کا حق
واجب زکوٰۃ دینے کے بعد سرمایہ جمع کرنا موجب عذاب خیال نہیں
کرتا تھا، لیکن اہل راز صحابہ نے اس گتھی کو سلجھا دیا۔

شریعت موسوی میں زکوٰۃ کے سوا اور کسی خیرات کا حکم نہ تھا
جو اہل خیر کے حوصلہ سے کم چیز تھی۔ دوسری طرف عیسوی شریعت
کا حکم سب کچھ لٹا کر خود فقیر ہو جانا تھا جو عملاً عام انسانوں کے حوصلہ
سے بہت اونچا درجہ تھا، شریعت محمدی نے دونوں باتوں کو
اس خوبی سے جمع کیا سب کے لئے قابل اور مفید تر صورت پیدا
ہوگی۔ شریعت موسوی کے مطابق نقد پر نصف مثقال اور پیداوار
پر عُشر بطور زکوٰۃ بدستور مقرر رکھا اور اسکے بعد دیگر خیرات وصدقات
عام مسلمانوں کی مرضی پر رکھ دیے اور ان کی ترغیب اسقدر دی کہ
مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے کہ جو کل کے لیے اُٹھا کر
رکھنا حرام سمجھتے تھے جیسے ابوذرؓ اور وہ بھی جو وقت پر اپنا سب کچھ
راہ خدا میں دینے کے لیے تیار تھے جیسے ابوبکرؓ ایسے بھی جو اپنی
تجارت کا کل سرمایہ راہ خدا میں دے ڈالیں جیسے عبدالرحمٰن بن عوف
اور ایسے بھی جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کا پیٹ بھریں جیسے علی
مرتضیٰؓ ان کی مدح میں خدا نے فرمایا۔

"اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وُہ خود
حاجتمند ہوں"

غرض تعلیم محمدیؐ مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق ہر ایک کے لیے نجات کا دروازہ کھولتی ہے تاکہ اہل حاجت کی عملی اور حقیقی امداد ہو سکتی ہے، وہ اہل ہمت کو بلند سے بلند روحانی معیار کی طرف دعوت دیتی ہے تاکہ باحوصلہ افراد شہپر ہمت سے اُڑ کر سدرۃ المنتہی تک پہنچ سکیں۔

چنانچہ شیخ شرف الدین منیریؒ اپنے مکتوبات میں اس گروہ کا حال لکھتے ہیں "اس فرقہ نے اپنی جان و مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا، ان کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور خون معاف ہو اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو ۔۔۔ دنیا کی نعمت پر زکوٰۃ بھی اس گروہ کے نزدیک بخیلی ہے۔ کیونکہ دو سو درم کو ایک سال تک بند رکھنا پڑتا ہے جب جا کر پانچ درم خدا کی راہ میں دیے جاتے ہیں"۔

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا فتویٰ نقل کرتے ہیں۔

"کسی فقیہہ نے حضرت شبلیؒ سے امتحاناً زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھا فرمایا فقہا کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقرا کے؟ کہا دونوں کے، فرمایا فقہا کے نزدیک سال گذرنے پر دو سو درم میں سے پانچ درم اور فقرا کے مسلک پر دو سو کے دو سو پورے اور اس پر مزید شکرانہ میں اپنی جان بھی، فقیہ نے کہا کہ ہم نے یہ مذہب آئمہ دین سے حاصل کیا ہے۔ شبلی نے کہا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر سے

حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا سب حضور کے سامنے رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضہ) کو شکرانہ میں دیا۔"

خود حضور کی زندگی بھی اسی دوسرے گروہ کی تائید کرتی ہے۔ کہ گھر میں چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے تو گھر میں آرام نہ فرماتے تھے، مگر عام امت کی سہولت کے لیے اپنا ذاتی مسلک امت پر فرض قرار نہیں دیا۔

سوالات

(۱) عبادات میں زکوٰۃ کو اہمیت کے لحاظ سے کیا درجہ حاصل ہے

(۲) اسلام اور دیگر مذاہب کے نظریوں کے لحاظ سے زکوٰۃ پر ایک جامع نوٹ لکھو۔

(۳) زکوٰۃ کی ابتدا اور اس کی تدریجی تکمیل پر روشنی ڈالو ضروری حوالہ جات نظر انداز نہ ہونے پائیں۔

(۴) زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مدت کیوں متعین کی گئی؟

(۵) زکوٰۃ کی مقدار کے بارے میں اسلامی و دیگر مذاہب کے نقطہائے خیال میں کیا تفاوت ہے

(۶) زمین، جانور، نقد اور مال تجارت کی زکوٰۃ کے بارے میں مختصر اور پُراز معلومات نوٹ لکھو۔

(۷) زکوٰۃ کے مستحق کون لوگ ہیں۔ اسلام سے پیشتر کیا صورت حال تھی اور اسلام نے اس میں کیا کیا اصلاحات کیں۔

(۸) اگر زکوٰۃ کے مستحقین میں دو شخص یکساں درجہ کے ضرورتمند ہوں تو ترجیح کس کو دیجائے گی اور کس بنا پر۔

(۹) ثابت کرو کہ اسلامی زکوٰۃ کے سسٹم نے غلامی کے انسداد میں مدد دی۔

(۱۰) سود اور صدقہ میں وجہ فرق بیان کرو۔

(۱۱) دولت مندی اور ذخیرہ اندوزی کی بیماری کا علاج دیگر مذاہب نے اور اسلام نے کس قدر طریقہ پر کیا اور کونسا طریقہ کامیاب رہا۔

زکوٰۃ کے مزید فوائد

اشتراکیت کا علاج دنیا میں مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ جس کی جڑ دولت کی غیر مساوی تقسیم ہے، کسی کو روپیہ رکھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی اور کسی کو روٹی کا سوکھا ٹکڑا اور سونے کو بالشت بھر زمین میسر نہیں، دولت مند سمجھتا ہے کہ یہ دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ میری کوشش کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں سست اور ناکارہ لوگوں کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ قارون کو جب حکم زکوٰۃ دیا گیا تو اُس نے یہی جواب دیا تھا۔

"مجھ کو تو ایک ہنر سے، جو میرے پاس ہے، یہ سب کچھ ملا ہے"

ہر زمانہ کے قارونوں کا یہی تصور و اعتقاد رہا ہے چنانچہ یونان کے آخری دور اور ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی۔ اور آج یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب و ہوا اقتصادی مشکلات کا سیلاب بپا کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے سوشلزم کمیونزم وغیرہ کے طوفان اُٹھ رہے ہیں۔ لیکن مساوات و برابری کے یہ خاکے بنانے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ طبع انسانی کے اس درجہ مخالف ہیں

کہ ان کی دائمی کامیابی مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اسکے حل کرنے کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ذاتی ملکیت کے جواز کے ساتھ جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے دولت کو چند ہاتھوں میں جانے سے روک دیا ہے، سود کی حرمت، وراثت کی تقسیم، جمہوری نظام حکومت، پرانے نظام زمینداری جس میں کاشتکار ایک غلام کی حیثیت رکھتا تھا، اس کی تنسیخ اور نئے اجیرانہ نظام کا قیام اور عام نفع کی چیزوں کو ملکیت عام قرار دینا اسی سلسلہ کے کامیاب قدم ہیں۔ بجائے اسکے سرمایہ داروں کا سرمایہ چھین کر سب کو برابر تقسیم کر دیا جائے یہ کیا کہ ہر معتدبہ سرمایہ دار پر سالانہ زکوٰۃ واجب قرار دے کر غربا کو ان کے سرمایہ میں لازمی شرکت دلائی، ضرورت پوری ہونے کے بعد جو بچ رہے اس کو صدقات میں خرچ کرنے کی تلقین و ترغیب دی یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اسلام کا دور تمدن مصیبتوں سے محفوظ رہا۔ اور آج بھی اسلامی ممالک اس سے محفوظ ہیں۔

حضرت عثمان رضی کے عہد خلافت میں شام میں حضرت ابوذر غفاری نے سونا چاندی گاڑ کر رکھنے کی قرآن میں مذمت آنے کے باعث یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے، ضرورت سے جو بچے ہر شخص کو راہ خدا میں دیدینا چاہیے دوسرے دولتمند

صحابہ نے کہا کہ ہم راہ خدا میں دے کر بچاتے ہیں۔ اس لیے یہ فتویٰ نہ مقبول عام ہوا اور نہ عوام میں اس سے کوئی فتنہ پیدا ہو سکا کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، بلکہ یہ آرام و آسائش عرب کا وہ زمانہ تھا کہ کوئی خیرات قبول کرنے والا نہ رہا تھا۔

اقتصادی اور تجارتی فائدے زکوٰۃ میں اقتصادی اور تجارتی فائدے بھی ہیں۔ پہلے گذرا کا زکوٰۃ انہی چیزوں میں واجب ہوتی جن میں دو صفتیں ہوں، یعنی بقا اور نمو کیونکہ جو چیز مدت تک باقی نہیں رہتی وہ دوسروں کے استعمال کے لیے ذخیرہ نہیں کی جا سکتی، اسی لیے سبزیوں، ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح جس چیز میں افزائش نہیں ہو سکتی جیسے جواہرات قیمتی پتھر یا غیر مزروعہ زمین اور مکان ان میں بھی زکوٰۃ نہیں۔ ان دونوں باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ زکوٰۃ فرض کرنے سے شریعت کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بند نہ پڑا رہنے دیں بلکہ اس کو تجارت و زراعت میں لگا کر بڑھائیں۔ ورنہ زکوٰۃ کی وجہ سے سال بہ سال سرمایہ میں کمی ہوتی چلی جائے گی جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہیں کر سکتا، اسی لیے ادائیگی زکوٰۃ کے لیے ایک سال مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے سرمایہ کو تجارت و زراعت میں لگا کر بڑھا لے چنانچہ صحابہ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت و کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔

فقرا کی اصلاح فقرا کا گروہ ہمیشہ دنیا کے تمام اہل مذاہب کے نزدیک قابل رحم رہا ہے۔ مگر پہلے تمام مذاہب کی ہمدردی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا ہو اور اس کا دوست اس کی حفاظت کرے کہ کہیں ٹھیس لگ کر ٹوٹ نہ جائے اور جراح کے نشتر سے اس لیے بچاتا ہو کہ اس کے چیرنے سے اس کو تکلیف ہوگی، کیا یہ نادان دوست واقعی دوست ہے؟

غرض اس بارے میں دوسرے مذاہب نے افراط و تفراط سے کام لیا۔ چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال کرنا قطعاً ممنوع قرار دیا گیا اس کے بالمقابل بودھ مت میں بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ بھیک مانگنے کے لیے پیدا کیا گیا، لیکن اسلام نے نہایت حکمت سے اس پھوڑے کا علاج کرنے کے لیے ماہر جراح کی طرح دونوں کام کیے ہیں اس نے اس میں نشتر بھی لگایا ہے اور مرہم بھی رکھا ہے، مرہم وہ مہربانیاں، تسلیاں اور عملی امدادیں ہیں جو غریب کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں، اور نشتر وہ اصلاحات ہیں جو اس کی پست ہمتی، لالچ اور دست نگری کو دور کرنے کے لیے جاری کیں کیونکہ اگر مالداروں کو ایک طرف خیرات کی ترغیب دی جائے تو دوسری طرف اس کی نگرانی بھی ضروری ہے کہ غریب طبقہ گداگری کا عادی نہ بن جائے، اصلاح حال دونوں کی منظور ہونی چاہیے، چنانچہ پیغمبر اسلام کی نظر میں امیر و غریب اور مسکین و دولتمند دونوں

یکساں ہیں، اس لیے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر وزن سے تولا ہے۔ داعی اسلام نے دونوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی تعلیم پیش کی اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت جوہر کو پیش کرنے اور نقائص کو دور کرنے کی صورت سمجھائی ایک طرف اگر اُمراء سے خطاب کیا کہ

"مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے" تو دوسری طرف خود دار غربا کی مدح یوں فرمائی کہ "ناواقف ان کی خود داری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولت مند سمجھتا ہے . . . . وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے"

بھیک مانگنے کو خلاف تقویٰ قرار دیا بھیک مانگ مانگ حج کرنے والوں کو خطاب کر کے کہا۔

"اور زاد راہ لے کر چلو کہ بہترین زاد راہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔ ایک طرف دولت مند سے کہا کہ مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ اگرچہ چھوارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو وہی دے دو تو دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ "خود داری کا تقاضا یہی ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ کیونکہ اُوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" یہ ہے وہ تعلیم جس نے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے مالا مال کر دیا۔

صدقات کو دینے والوں کے قلوب کے تمام میل کچیل کو صاف کرنے والا کہا۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ "یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے" اس سے اسطرف اشارہ ہے کہ فقرا کو شدید حاجت میں کوئی جب کوئی اور صورت معاش کی نہ ہو اُسی وقت اس کو قبول کرنا چاہیئے ورنہ غیر مستحق فقرا جو اِس میل سے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھوٹا ہے اپنے دامن دل کو نجس بنالیں گے، جس سے ان میں بے حیائی بے غیرتی، حرص، طمع غرض ہر قسم کی بُرائی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور مجبوری کے عالم میں قبول کر لینے کے بعد بُرے اخلاق و عادات سے بچانے کے لیے حسب ذیل مفید تدابیر بتائی ہیں

(۱) صدقہ و زکوٰۃ محض لوجہ اللہ ہو لینے والے پر کسی قسم کا احسان نہ دھرا جائے۔ قرآن میں ہے۔

"ہم تم کو خدا کے لیے کھلاتے ہیں ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہیئے"

پھر صدقہ دینے والے کو بتا دیا کہ احسان دھرنا ان کے اس عظیم الشان کارنامہ کو باطل کر دے گا۔ چنانچہ فرمایا۔

لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى — اپنے صدقات کو احسان دھر کر اور تکلیف دے کر برباد نہ کرو۔

نیز فرمایا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى — کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جسکے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے۔

اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے بیت المال میں جمع کرنے کا جو طریقہ رائج کیا ہے منجملہ اور اسباب کے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح غریب لینے والا دوسرے شخص کا مرہون منت ہو کر ذلت محسوس نہ کرے گا، امیر جماعت حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے گا۔ اور اس طرح پوری قوم کا معیار اخلاق بلند رہے گا۔

(۲) اسی لیے صدقہ کو چھپا کر دینے کا حکم ہے کہ اعلانیہ دینے سے سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے اس طرح یہ اظہار و اعلان گداگری کا موجب بن جائے گا، پھر چھپا کر دینے میں دینے والا بھی نمائش و ریاکاری سے محفوظ رہتا ہے اسی لیے حضورؐ نے فرمایا "بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو"۔ ہاں دوسروں کو ترغیب دلانے کے مواقع پر اظہار صدقات میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ اس کو قرآن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

"اگر تم صدقہ کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر فقرا کو دو تو یہ تمھارے لیے بہت ہی اچھا ہے"۔

مفسرین نے اس اخفا کو عام خیرات کے لیے مخصوص کیا ہے اور زکوٰۃ میں ترغیب و تشویق اور عدم ادائیگی کی تہمت سے محفوظ رہنے کے لیے اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ زکوٰۃ کا اصل طریقہ بیت المال میں جمع کرا دینا ہے اس لیے اخفا کا مقصد اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ خواہ بیت المال میں جمع کرنا علی الاعلان ہو لیکن آیت کا

اشارہ، اس طرف ہے کہ تم خود فقرا کو دو تو چھپا کر دو اس میں زکوٰۃ
اور عام صدقات برابر ہیں مگر آج اسکے برعکس حالت یہ ہے کہ معمولی سے
معمولی رقم کے لیے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیے
جائیں تو دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی

(۳) اخلاق اور تمدنی ترقی کا مدار عالی حوصلگی پر ہے اس لیے اسلام
نے حکم دیا کہ زکوٰۃ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ دینے
والے کی دنائت نفس ظاہر ہو اور نہ لینے والے میں گلی سڑی چیز
لے کر دنائت نفس پیدا ہو اسی لیے اصحاب صفہ کے لیے جو بعض
لوگ بدمزہ کھجوروں کے خوشے مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور وہ بھوک
کی شدت سے مجبور ہو کر ان میں سے دو چار کھجوریں کھا لیتے تھے ان
کو اس ذلیل حرکت پر تنبیہ کے لیے یہ آیت نازل ہوئی "اے ایمان
والو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین
سے نکالی ہے بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان میں سے ردی مال کی
خیرات کا قصد نہ کرو حالانکہ وہی اگر تمھیں دیا جائے تو تم نہ لوگے
لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی
خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے"

(۴) فقرا کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کے لیے اسلام
نے بہترین طریقہ یہ اختیار کیا کہ خود دار اور مستور الحال حاجتمندوں
کو زکوٰۃ و صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا کیونکہ اس صورت میں دوسرے

فقرا بھی ان کی تقلید پر مجبور ہوں گے اسی لیے قرآن میں ہے کہ "صدقہ ان فقرا کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (معاش کے لیے) زمین میں سفر کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، جو لوگ اُن سے ناواقف ہیں، خودداری اور سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف اُن کے بشروں سے اُن کو پہچانتے ہو وُہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے"۔

(۵) گداگری فی نفسہ ایک مبتذل شیوہ ہے گو نہایت سخت مجبوری پر اسلام نے سوال کی اجازت دی ہے مگر حتی الامکان لوگوں کو ہر حال میں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیعت میں بعض لوگوں سے یہ عہد کراتے تھے کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگیں گے۔ اس شدت کا یہ اثر ہُوا کہ کسی کا کوڑا راستہ میں گر جاتا تھا تو وہ کسی سے یہ بھی نہ کہتا تھا کہ اُٹھا دو ایک دفعہ حضورؐ نے کسی سے کچھ نہ مانگنے کی ضمانت پر جنت کی بشارت سنانے کا وعدہ فرمایا تو آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں چنانچہ اس کے بعد انہوں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔

حکیم بن حزامؓ نامی ایک صحابی نے حضور سے بار بار مال مانگا اس پر حضور نے فرمایا "اے حکیم مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ ہے، جو اس کو شرافت سے لے گا اس کو برکت دی جائے گی،

اور جو لالچ سے لے گا اس کو برکت نہ ملے گی ..... اُوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" حکیمؓ نے کہا یا رسول اللہ آج سے میں کسی سے کچھ نہ مانگوں گا - اس کے بعد خلافت راشدہ کے زمانہ میں بلائے جانے پر بھی اپنا وظیفہ لینے نہ جاتے تھے اور آخر تک اسی انکار پر قائم رہے -

مالدار اور روزی کمانے پر قادر لوگوں کے لیے صدقات دینے لینے کی سخت ممانعت کی گئی - حضور نے فرمایا" مالدار اور صحیح و سالم آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں - نیز فرمایا" قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اُٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اُسے دے یا نہ دے"

ایک دفعہ ایک غریب صحابی نے خیرات مانگی تو حضور نے فرمایا کہ "تمہارے پاس کچھ ہے" عرض کی" ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ" آپ نے ان کو نیلام کر کے ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی کہ "جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور اُسے بیچو"

(۶) جو لوگ کسب معاش کرنے سے معذور ہیں ان کو بھی الحاج اور کثرت سوال سے بشدت روکا، حضور نے فرمایا "مسکین وُہ نہیں جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں، مسکین وُہ ہے جو گو بے نیاز نہیں لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا

کر نہیں مانگتا۔

سوال کی بے غیرتی اور بے حیائی کی سزا یہ بتائی کہ قیامت میں اس قسم کے عادی بھکاری کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہو گا۔

غرض ان اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کر کے تمام برائیوں کا سدباب کر دیا حضورؐ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دولتمند صحابہ میں فیاضی آ گئی اور غریب صحابیوں میں قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ لے کر خود بیت المال کے دروازہ پر آتے تھے اور غریب اپنی حاجت کو خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لیجاتے تھے حتیٰ کہ حضورؐ کے عہد کے بعد جب فراغت کا دور آیا تو بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مستحق کے لیے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، ضرورتمندوں کو اس رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا اور سود کی لعنت کے بغیر اس طرح قرض کے لین دین کا راستہ کھلا ہُوا تھا۔

سوالات

(۱) ثابت کرو کہ اسلامی زکوٰۃ اشتراکیت کی پھیلی ہوئی وبا کا صحیح علاج ہے۔

(۲) فقراء کے گروہ کی اصلاح کا کام کس مذہب نے باحسن وجوہ

انجام دیا۔ اس سلسلہ میں اسلام کا مطمح نظر واضح کرو۔

(۳) زکوٰۃ و خیرات لینے سے فقراء کے گردہ میں جو بُری عادتیں حرص و طمع اور پست فطرتی پیدا ہونے کا اندیشہ قوی ہے ان سے بچاؤ کی اسلام نے کیا تدابیر اختیار کیں۔

(۴) سوال کی مذمت کے بارے حضور کا وہ قول جو حکیم بن حزام صحابی سے آپ نے فرمایا نقل کرو اور بتاؤ اس کا اثر صحابی موصوف پر کیا ہُوا۔

روزہ

خدا کا فرمان ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں)

روزہ کا مفہوم روزہ عبادات کا تیسرا رکن ہے۔ عربی میں اس کا نام "صوم" ہے۔ جس کے معنی رُکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ قرآن نے اس کو "صبر" کے نام سے بھی یاد کیا ہے جس کے معنی ضبط نفس اور ثابت قدمی کے ہیں، ہوا و ہوس نفسانی سے رُکنا اور حرص و ہوس کے مواقع پر ثابت قدم رہنا یہی روزہ کی حقیقت ہے۔ انسانی خواہش کے عام مظاہر تین ہیں، کھانا[۱]، پینا[۲] اور عورت[۳]، ایک معین وقت کے لیے انہی تینوں سے باز رہنے کا شرعی نام روزہ ہے۔ خواص کے نزدیک باطنی خواہشات سے بچنا بھی روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدا روزہ کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں انگلستان کے حکیم ہربرٹ اسپنسر کا قیاس ہے کہ "روزہ کی ابتدا یوں ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ کا کھانا اس طرح مُردوں

کو پہنچ جاتا ہے" لیکن اہل عقل کے نزدیک اس قیاس کی کوئی قیمت نہیں۔

مشرکانہ مذاہب میں روزہ کے اسباب کچھ بھی ہوں مگر اسلام کے روزہ کے بارے خود اس کا اعلان یہ ہے۔

"مسلمانو! تم پر اسی طرح روزے فرض ہوئے جس طرح تم سے پہلی قوموں پر تاکہ تم پرہیز گار بنو، اور رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔ جو انسانوں کے لیے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیل اور حق و باطل میں فارق بن کر آیا تو جو اس رمضان پائے وہ اس مہینہ کے روزے رکھے"

ان آیتوں سے روزہ کی ابتدا، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب ان تمام امور پر روشنی پڑتی ہے آئندہ اسی کی تفصیل آئے گی۔

روزہ کی مذہبی تاریخ

آیات بالا سے روزہ کا دوسرے مذاہب میں وجوہ ظاہر ہے اس دعویٰ کی تصدیق میں مستند حوالہ درج ذیل ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں روزہ (فاسٹنگ) کا مضمون نگار لکھتا ہے۔

"روزہ کے اصول اور طریقے گو مختلف ہیں لیکن بہ مشکل مجموعی کوئی مذہب ایسا ہوگا جسمیں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو"

آگے چل کر لکھتا ہے۔

"روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے"
ہندوستان جو قدامت کا مدعی ہے اس میں برہمنوں پر اکاوشی کا روزہ ہر مہینہ کی گیارہ بارہ کو فرض ہے اس طرح سال کے چوبیس روزے ہوئے، جینی دھرم میں روزے کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن کا ایک روزہ ہوتا ہے۔ قدیم مصریوں میں روزہ مذہبی تہواروں میں شامل نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزہ رکھتی تھیں۔ پارسی مذہب گو عوام کے لیے نہ سہی، مگر مذہبی پیشواؤں کے پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔

یہود حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر چالیس روز بھوکے رہنے کے اتباع میں چالیس دن روزے رکھنا اچھا خیال کرتے تھے، لیکن چالیسواں روزہ فرض سمجھا جاتا تھا جو ماہ تشرین کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے۔ عیسائی مذہب میں بھی روزہ کا وجود ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ اُن سے قبل حضرت یحییٰؑ روزہ رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔
اہل عرب بھی اسلام سے پیشتر روزہ سے واقف تھے قریش مکہ محرم کی دسویں تاریخ یوم عاشورا کو روزہ رکھتے تھے۔ مدینہ کے یہود اپنا عاشورا اپنے ساتویں مہینہ تشرین کی دسویں تاریخ

کو الگ مناتے تھے۔

روزہ کی حقیقت انسان کے ہر عمل اور اسکے بدن ایک ایک عضو کی حرکت کی تہ میں کوئی نہ کوئی نفسانی غرض ہوتی ہے اور اس کی بدبختی اور ناکامی کی اصل وجہ یہ نفسانی غرض ہی ہوتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں کے اغراض و مقاصد کے لامتناہی سلسلہ کی حقیقت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب خود ساختہ ضرورتوں اور دنیوی تمناؤں کا ایک انبوہ ہے جنکے بغیر بھی انسانی زندگی پُر مسرت گذر سکتی ہے جیسے کہ ابراہیم ادھم کے متعلق مشہور ہے کہ بادشا۔ چھوڑ کر بھی اُنہوں نے پرمسرت زندگی بسر کی۔

ان خود ساختہ ضرورتوں کی نفی کے بعد انسان کی حقیقی ضرورتیں صرف دو۲ رہ جاتی ہیں یعنی کھانا اور پینا جسکے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا مگر اس کے لیے چند سادہ لقمے اور پانی کے چند گھونٹ بھی کافی ہیں، اس میں افراط و وسعت نفس اور تعیش کا نتیجہ ہے انسان کے تمام گناہوں کی فہرست تیار کی جائے تو بیشتر انہی دو۲ چیزوں میں افراط کا نتیجہ ہوں گے۔

اس بنا پر ہر مذہب نے اکل و شرب (کھانے پینے) کچھ پابندیاں عائد کی ہیں تاکہ انسان اپنی ان ضرورتوں کا دائرہ کم کرے لیکن چونکہ انسان رہتے ہوئے اس سے بالکل بےنیاز

نہیں ہو سکتا اس لیے تمام مذاہب نے اس سے اجتناب و بے نیازی کی ایک حد معین کر دی ہے تاکہ انسان اپنی ضروریات سے مستغنی ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو سکے اور اس مدت میں ان کی طرح اپنی زندگی کا مقصد خدا کی اطاعت و عبادت کو سمجھے۔

قرآن نے اس پوری حقیقت کو ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کر دیا ہے پس معلوم ہوا کہ اسلامی روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے یعنی خواہشات پر قابو رکھنا اور جذبات کی رَو میں بہ نہ جانا۔ آگے چل کر قرآن نے روزہ کی دو اور مخصوص حکمتوں کو واضح کیا ہے، فرمایا۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی ہے اس پر تم اس کی بڑائی بیان کرو اور شکر ادا کرو۔

اس کی وضاحت کے لیے رمضان کی ماہیت کا سمجھنا ضروری ہے۔

رمضان کی ماہیت

قدرت نے عالم مادی کی طرح عالم روحانی میں سلسلہ علل و اسباب رکھا ہے جس طرح طبیب جسمانی ظاہر کو جسم کے لیے مہلک بتاتا ہے اسی طرح طبیب روحانی گناہ کو مہلک روح ٹھہراتا ہے پس روحانی ترقیوں اور نبی

کے کمال نبوت تک پہنچنے کی استعدادوں کا روحانی سلسلہ بھی ایک مرتب و منظم سلسلہ ہے۔ قرآن میں تیرہ[۱۳] مقام پر "سنتہ اللہ" کا لفظ آیا ہے جن میں سے بیشتر جگہ اسی روحانی نظام کی طرف اشارہ ہے،

پیغمبرانہ تاریخ بتاتی ہے کہ نبی کمال انسانیت پر پہنچنے کے بعد جب فیضان نبوت کے قبول واستعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ عالم انسانی سے الگ ہو کر کچھ عرصہ کے لیے ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ جب توراۃ لینے طور پر گئے تو چالیس روز بھوکے پیاسے رہے، حضرت عیسیٰؑ اس سے پیشتر کہ ان کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو چالیس شب و روز بھوکے رہے اسی طرح دنیا کے آخری پیغمبرؐ نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ غار حرا میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہے اور اسی اثنا میں پہلی وحی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کا مژدہ لے کر نمودار ہوئے۔ یہ مہینہ رمضان کا .... اور یہ رات مبارک شب قدر تھی، پس یہ مہینہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں حضورؐ کو عالمگیر رہنمائی کے لیے دستور نامۂ الٰہی کا پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ ان دنوں میں حضورؐ مکہ و تنہا غار حرا میں بھوکے پیاسے خدا کے سامنے سر بزانو تھے اس لیے اس ماہ میں روزہ اور کسی مسجد کے گوشہ میں اعتکاف اور نزول وحی کی رات یعنی لیلۃ القدر میں بیدار اور سر بسجود رہنا پیروان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری تھا۔

فرضیت روزہ کا مناسب موقع سنہ ۲ھ میں روزہ فرض ہوا کیونکہ یہی زمانہ مسلمانوں کے امن و اطمینان کا تھا اور اسلامی فتوحات کے شروع ہو جانے کی وجہ سے دنیاوی لذائذ کا سامان فراہم ہونے لگا، مکہ کی زندگی میں نہ امن و اطمینان حاصل تھا اور ساز و سامان دنیوی اس لیے دنیا کی شگفتگی اور لذات حسی میں مشغول ہونے کا خدشہ ہی نہ تھا اب ہجرت کے بعد مدینہ میں جب وہ وقت عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اصلی صورت میں جلوہ گر ہو کر مسلمانوں کو اپنا فریفتہ بنائے تو گویا یہ تداخل فصلین کی طرح امراض کے پیدا ہو جانے کا زمانہ تھا جس کی احتیاط کے لیے روزہ فرض ہُوا ورنہ جسمانی ریاضت اگر مقصود نظر ہوتی تو روزہ نماز سے پہلے فرض ہوتا علامہ ابن قیمؒ زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لیے روزہ وسط اسلام میں فرض ہُوا جبکہ لوگ توحید، نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے اس لیے یہ اضافہ عبادت اسی وقت کے لیے موزوں تھا۔

ایام روزہ کی تعیین روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہیے، اگر روزہ کو روزانہ کی عبادت بنا دیا جاتا تو جسمانی طاقت کا خاتمہ ہو جاتا اور شگفتگی مزاج مٹ جانے کی وجہ سے دوسری عبادات کا اثر بھی جاتا رہتا اس لیے اسلام نے سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ اس کے لیے مقرر

کیا اور اس کے لیے اُس مہینہ کو منتخب کیا جس میں قرآن اُترنا شروع ہُوا تھا یعنی رمضان بھر روزہ چونکہ ایک مشقت کی چیز تھی اس لیے قرآن میں اس کی فرضیت کا اعلان نہایت بلاغت سے تدریجی طور پر کیا گیا۔ روزہ کی فرضیت کا اظہار کر کے ساتھ ہی تشفی کے لیے کہہ دیا کہ تم سے اگلوں پر روزے فرض تھے، مدت کا ابھی ذکر نہیں کیا بعد میں "چند گنے چنے دن" کہہ کر اس کو ہلکا بنایا، اس کے بعد کچھ سہولتیں دینے کا اظہار کیا کہ "اگر کوئی مریض یا مسافر ہو تو وہ دوسرے گنتی کے دنوں میں روزے رکھ لے" اس انداز سے یہ معلوم ہو گیا کہ روزہ کی فرضیت کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہو گی۔ اتنی تمہیدوں کے بعد روزے کے ایام مقرر کیے جاتے ہیں اور پہلے ماہ رمضان کی فضیلت اس طرح بیان کر دی جاتی ہے کہ یہ وہی مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہُوا اس کے بعد فرمایا "تو جو اس مہینہ کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزے رکھے" یعنی روزوں کا آغاز اس ماہ کے آغاز اور اختتام اس کے اختتام پر ہو گا، خواہ مہینہ ۲۹ دن کا ہو، ۳۰ دن کا جیسا کہ قمری مہینوں میں ہوتا ہے اور عرب میں یہی مہینے رائج تھے۔

ایک نکتہ | قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ — تو جو شخص اس مہینہ کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزے رکھے۔

شَہِدَ کے معنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں۔ یعنی روزے اُسی پر فرض ہیں جو اس مہینہ میں موجود ہو اسکے بالمقابل دو[2] صورتیں ہیں یعنی ماہ[1] صیام آنے اور آدمی موجود نہ ہو مر چکا ہو یا ماہ صیام کا وہاں گذر نہ ہو جہاں آدمی موجود ہے جیسے چین کے بعض حصے جہاں کئی مہینے کا دن اور کئی مہینے کی رات ہوتی ہے ان دونوں صورتوں میں روزہ کی فرضیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہاں اگر لوگ خود چاہیں تو دوسری ملکوں کی جنتری کے مطابق دن کے گھنٹے متعین کر کے روزہ رکھ اور کھول لیں اس کی اجازت ہے۔

اسی طرح وہ ملک جہاں بیس بیس گھنٹہ کا دن ہوتا ہے تو وہاں لوگ اگر برداشت نہیں کر سکتے تو اس آیت پر عمل کر سکتے ہیں۔

"اور جو بمشکل روزہ رکھ سکیں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے"

روزہ پر اعتراض اور اسکا جواب

اعتراض یہ ہے کہ یہ تو وحشی انسانوں کا تخیّل ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے اور روزہ بھی جسمانی زحمت کشی ہے، جواب یہ ہے کہ یہ غلط فہمی دوسرے مذاہب کے بارے میں تو ہو سکتی ہے جیسے جینی، جوگی کہ ان کے ہاں غیر معمولی مدّت کے لیے سخت پابندیوں کے ساتھ روزہ تھا یا یہودیوں کی اصطلاح کی رُو سے روزہ کو دکھ کی چیز کہا جا سکتا ہے کیونکہ توراۃ میں روزہ کے لیے اسی قسم کا فقرہ استعمال ہوا

"اس ساتویں مہینے (تشرین) کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دُکھ دو اور کچھ کام نہ کرو" لیکن اسلام نے جہاں روزہ کا حکم دیا ہے ساتھ یہ الفاظ بھی کہہ دیئے ہیں۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ — خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے،
وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ — سختی نہیں چاہتا۔

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات میں کوئی بھی ایسی نہیں رکھی گئی جس کا مقصد ہی انسان کی جان کو دُکھ پہنچانا ہو اسی لیے اسلام نے روزے کی اُن شخصیتوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بڑی حد تک کم دیا۔

روزہ کی اصلاحات اسلام نے روزہ میں جو سہولتیں پیدا اور سختیاں کم کیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسلام نے روزہ سب پر خواہ پیشوا ہو یا غیر پیشوا مرد و عورت سب پر فرض کیا ہندوؤں کی طرح صرف برہمنوں پر یونانیوں کی طرح صرف عورتوں سے ہی مخصوص نہیں رکھا چنانچہ اس کا حکم عام یہ ہے "اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر کے روزے رکھے"۔

(۲) قمری مہینہ مقرر ہونے سے ہر جگہ اور ہر ملک میں روزہ مختلف فصلوں میں تبدیل ہوتا رہے گا اس لیے اس کی سختی و نرمی بدلتی رہے گی، دوسرے مذاہب کی طرح شمسی ماہ مقرر ہونے کی وجہ کسی ایک فصل گرمی یا سردی سے ہی مخصوص نہیں۔

(۳) دیگر مذاہب میں کسی حالت میں انسان روزہ سے مستثنیٰ نہ تھا توراۃ میں تو یقیناً کوئی استثنا نہیں ہے لیکن اسلام نے فطرت شناسی سے کام لے کر مجبوروں اور معذوروں کو مستثنیٰ کر دیا بچے، عورتیں بعض حالات میں، بڈھے، بیمار اور مسافر سب مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ نہیں رکھ سکتے مستثنیٰ ہیں، عارضی معذور مثلاً مسافر، بیمار وغیرہ عذر دور ہونے کے بعد اتنے دن کی قضا بعد کو رکھ لیں اور دائمی معذور ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

(۴) دوسرے مذہبوں میں روزہ کے دن غیر معتدل تھے یا تو چالیس چالیس دن کا فاقہ تھا یا غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے صرف ایک مہینہ کے روزوں میں گو ہر قسم کی چیز کھانے سے ممانعت کر دی مگر طلوع آفتاب سے غروب تک کے چند گھنٹے کی مدت مقرر کر دی۔

(۵) یہودیوں کے ہاں روزہ کھولتے وقت جتنا کھا لیا کھا لیا پھر اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ عرب میں سو جانے کے بعد پھر اُٹھ کر کھانا ناجائز تھا اسلام نے صبح صادق کے طلوع سے پہلے پہلے کھانے کی اجازت دے دی۔

(۶) شروع اسلام میں دستور تھا کہ مرد راتوں کو بھی روزہ کے زمانہ میں بیوی سے علیحدہ رہتے تھے۔ چونکہ یہ غیر فطری مدت

نفسانی خیانت کی موجب ہو سکتی تھی اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کردی اور رات کو اجازت دیدی۔

(۷) بھول چوک اسلام میں معاف ہے اس لیے بھولے سے کھا لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۸) اسی طرح غیر ارادی طور پر منافی روزہ افعال سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۹) یہودیوں کو غم کی علامت و یادگار تھا اس لیے وہ روزہ میں زینت سے بھی پرہیز کرتے تھے لیکن اسلام نے روزہ میں زینت کرنا مثلاً تیل لگانا خوشبو لگانا روزہ کی خوبی قرار دیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ روزہ دار روزہ کی مشقت کو ہنسی خوشی برداشت کر رہا ہے۔

(۱۰) روزہ دوسری عبادات کے مقابلہ زیادہ مشقت رکھتا ہے، اس لیے رسول اللہ خود اگرچہ زیادہ روزے رکھتے تھے کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے لیکن رمضان کے علاوہ روزہ دل کو مستحب رکھا اور رات دن کے متصل روزہ کی تو عام امت کے لیے ممانعت فرما دی۔

روزہ کے مقاصد قران نے روزہ کے مقاصد مختصر تین فقروں میں بیان کردیے ہیں۔

(۱) لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔

۱۔ تاکہ تم کو خدا نے جو ہدایت کی ہے اس پر اُس کی بڑائی ظاہر کرو۔

(۲) وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۲- اور تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

(۳) وَلَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ ۳- اور تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

پہلے گذر چکا ہے کہ ہر پیغمبر نے شریعت اُترنے سے پیشتر کچھ مدت ملکوتی زندگی بسر کی کھانے پینے سے پاک رہے اسی طرح حضورؐ نے غار حرا میں ایک مہینہ تک عبادت کی اس کے بعد قران اُترا پس روزہ کی فرضیت کا سب سے پہلا مقصد حضورؐ کی پے روی اور تقلید ہے یعنی مسلمان اپنے رسولؐ کی پیروی میں ایک مہینہ کھانے پینے اور خواہشات نفسانی سے مبرا رکھ کر ملکوتی زندگی بسر کریں۔

شکریہ روزہ اس احسان عظیم کا شکریہ ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر کیا یعنی ہدایت کے لیے کتاب الٰہی نازل فرما کر کیا جس نے ان کو شیطانی ظلمت سے نکال کر نور ایمان سے سرفراز کیا۔ اور وحشت کو اخلاق سے، جہالت کو علم سے، اور نادانی کو حکمت سے بدل دیا قران نے اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"اور (یہ رمضان کا روزہ اس لیے فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم اس کو شکریہ ادا کرو۔"

غرض خدا کی اظہار عظمت و شکریہ کے بعد روزہ کے حسب ذیل مقاصد ہیں۔

(۱) تقویٰ روزہ کا معنوی مقصد دل کی صفائی اور پرہیزگاری ہے تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد انسان گناہوں سے جھجکنے لگتا ہے، چونکہ گناہوں کا جذبہ عموماً بہیمی قوت کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے اور روزہ اس قوت کی شدت کو کم کر دیتا ہے اس لیے حضورؐ نے ان نوجوانوں کے لیے جو نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور جذبات نفس سے بھی مجبور ہیں یہ علاج تجویز کیا کہ وہ روزے رکھیں اور فرمایا "روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے"

(۲) روزہ کی مشروعیت میں غربا اور فقرا کو کھانا بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ رمضان کے دنوں میں لوگ ایک وقت کھائیں اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا غربا کو کھلائیں اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ مساکین کو کھانا کھلانے کا قائم مقام ہے اور کھانا کھلانا روزہ کا قائم مقام ہے چنانچہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ان کو ایک روزہ کے بدلہ ایک غریب کو دو وقت کھانا کھلانے کا حکم ہے اور حج کے زمانہ میں اگر کوئی جان بوجھ کر شکار کرے جس کی کہ اس زمانہ میں ممانعت ہے تو اس پر شکار کے مماثل جانور کی قربانی یا چند مسکینوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے مساوی روزے رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِينَ أَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا	یا چند مسکینوں کا کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے۔

(۳) روزہ سے امرا کو غربا کی بھوک کا اندازہ ہوتا ہے اور اس ان کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ غربا کو کھانا کھلانا کار ثواب ہے، کیونکہ جب خود کوئی بھوکا نہ رہے اس کو دوسرے کی بھوک پیاس احساس کیونکر ہو سکتا ہے، بقول حافظ ابن قیم سوختہ جگر کے سمجھنے کے لیے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔

(۴) روزہ سے بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے جو جہاد و جنگ کے مواقع پر اور دیگر مصائب کے وقت کام آتی ہے جس کے سبب سپاہی جنگ کے میدان میں بھوک پیاس کی شدت کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتا ہے اس لحاظ سے گویا روزہ ایک قسم کی فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سالانہ ایک مہینہ تک کرائی جاتی ہے

(۵) روزہ طب کے لحاظ سے صحت کے واسطے مفید ہے کیونکہ جس طرح حد سے زیادہ بھوکا رہنا کمزوری جسم کا باعث ہے اسی طرح زیادہ کھاتے رہنا بھی موجب امراض گوناگوں ہے۔ طب کے تجربے بتاتے ہیں کہ بعض امراض کا علاج ہی بھوکا رہنا ہے۔ ہفتہ میں ایک بار ایک وقت کا کھانا ناغہ کرنا طبًا مفید ہے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون روزے بھی ہیں اور سالانہ ایک ماہ کے فرض روزے بھی اگر روزہ دار نے سحر و افطار میں خود بے اعتدالی نہ کی ہو تو خود اس کو معلوم ہو جائے گا کہ روزے صحت کے لیے کسقدر نفع بخش ہیں اس لیے روزہ گویا ایک جبری جسمانی علاج ہے جو ہر مسلمان کے لیے سالانہ ضروری ہے

(۶) روزہ رکھنے کی وجہ سے جو خاصہ وقت کھانے پینے کے دھندوں سے بچ رہتا ہے اُس کو عبادتِ خدا میں صرف کرنے کا موقع روزہ رکھنے کی وجہ سے مل جاتا ہے۔

(۷) دماغی اور روحانی یکسوئی کے لیے مناسب فاقہ بہترین تدبیر ہے روزہ کی بدولت یہ چیز حاصل ہوتی ہے جیسا کہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ ہے۔

(۸) روزہ بہت سے گناہوں سے باز رکھتا ہے اسی لیے وہ گناہوں اور خطاؤں کا کفارہ قرار دیا گیا ہے۔ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے، اسلام میں بھی بعض مواقع پر اس کو کفارہ بتایا گیا ہے چنانچہ قسم کھا کر کوئی اس کو توڑ دے تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے روزے۔

(۹) روزہ کی بھوک اور فاقہ گرم اور مشتعل قوی کو سرد کر کے اور دل و دماغ میں سکون اور طبیعت میں جمعیت کی کیفیت پیدا کر کے ہمیں اپنے اعمال و افعال کے محاسبہ، خطاؤں پر شرمساری اور نیکی کے اعمال کا شوق دلاتا ہے اسی سبب سے رمضان کا زمانہ عبادات اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح، اعتکاف، زکوٰۃ کی ادائیگی اور دیگر خیرات کے طریقے اسی لیے رکھے گئے ہیں۔ رسول اللہؐ کی فیاضی گو سدا بہار تھی لیکن رمضان میں وہ مظہر صد بہار ہو جاتی تھی۔

(۱۰) روزہ صرف ظاہری بھوک پیاس کا نام نہیں بلکہ روح کی بھوک

پیاس کا نام ہے اس لیے کسی نے روزہ رکھ کر گناہ سے اجتناب نہ کیا تو گو جسم کا روزہ ہو گیا مگر روح کا روزہ نہ ہُوا اور وہی اصل مقصود تھا چنانچہ حضورؐ نے فرمایا: "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے" اسی لیے روزہ میں فحش گوئی، غصہ، جھوٹ اور غیبت وغیرہ سخت معیوب قرار دیا ہے یہاں تک کہ کوئی روزہ دار سے لڑے اور گالی دے تو وہ صرف یہی کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں اور اسی وجہ سے بعض علما کا فتوٰے یہ ہے کہ جس طرح کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

(۱۱) روزہ تمام عبادات کی اصل و بنیاد ہے کیونکہ یہ خاموش عبادت ہے جس میں نمود و ریا نہیں پائی جا سکتی اور یہی اصل تقویٰ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

(۱۲)، اس اخلاص و بے ریائی کی وجہ سے روزہ خدا کی خوشنودی اور نیک جزا کا مستحق ہے حدیث قدسی ہے۔

اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ روزہ (خالصتہً) میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دونگا۔

(۱۳) روزہ بھی ایک قسم کا صبر ہے جس کی تلقین مصائب و شدائد کے وقت کی گئی ہے تاکہ حل مشکلات ہو پس روزہ بھی مشکلات

پر قابو پانے کا ذریعہ ہے اسی لیے آیت ذیل میں صبر کے معنی روزہ کے لیے بھی لیے گئے ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ‏ اور (مشکلات پر) دعا اور صبر سے مدد حاصل کرو۔

(۱۴) روزہ بھی اُن اعمال حسنہ میں سے جن کے بدلہ میں خدا نے خطاپوشی اور گناہوں کی معافی کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے۔

"اور روزہ دار مرد اور عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں اور خدا کو یاد کرنے والے مرد اور عورتیں ان کے لیے اللہ نے معافی اور بڑی اُجرت تیار کر رکھی ہے"۔

یعنی روزہ ہمارے مادی اور روحانی دونوں قسم کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

سوالات

(۱) روزہ کا مفہوم اور اس کی ابتدائی تاریخ پر مختصر نوٹ لکھو۔

(۲) ماہ رمضان کی حقیقت و اہمیت پر روشنی ڈالو۔

(۳) ثابت کرو کہ روزہ کی فرضیت کا مناسب زمانہ ۲ھ ہی تھا۔

(۴) روزہ کے لیے مدت معین کر دینے میں کیا حکمت ہے۔

(۵) یہ خیال کہ روزہ وحشی انسانوں کے اس تخیل کی پیداوار ہے کہ خدا انسانوں کے تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا

ہے، کہاں تک صحیح ہے؟

(۶) اسلام نے روزہ کی سختیوں کو کیا کیا سہولتیں دے کر کم کر دیا۔

(۷) روزہ کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی کلام کرو۔

(۸) روزہ کا معنوی مقصد تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔ تمہارے پاس اس کے ثبوت میں کیا دلائل ہیں۔

حج

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ — اور اللہ کیلئے لوگوں کو خانہ کعبہ حج کرنا فرض ہے

حج کا مفہوم | حج اسلامی عبادات کا چوتھا رکن ہے اس کے لفظی معنی "قصد وارادہ" کے ہیں۔ اسلام کے نزدیک حج خانہ کعبہ کے گرد گھومنا اور مکہ کے مختلف مقامات مقدسہ میں حاضر ہو کر کچھ اداب بجالانے کا نام حج ہے۔

مکۃ اللہ انسانی ترقی کے تمام تدریجی مدارج کی ایک مرتب تاریخ ہے وہ حضرت ابراہیمؑ عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسمٰعیلؑ کے عہد میں چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی بستی بن گیا۔ پھر رفتہ رفتہ عرب کا مذہبی شہر قرار پایا اور حضورؐ کی بعثت کے بعد اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز بن گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب کا رخ کیا انہیں اپنے خاندان اور قوم کی تکلیفوں سے نجات پانے کے لیے اپنے آبائی وطن عراق سے ہجرت کرنی پڑی فاران کی وادی میں اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو بسایا اور دوسرے بیٹوں بھتیجوں کو دوسرے اہم

مقامات پر بسایا جہاں سے تجارتی قافلوں کے ساتھ ملنے کا اور تجارت کا موقع بھی اور خدا کی توحید خالص کی عام تبلیغ بھی ہو سکے۔

بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ کا دستور تھا کہ جہاں روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر نصب کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے۔ توراۃ میں اس قسم کی متعدد قربان گاہوں اور خدا کے گھروں کا ذکر ملتا ہے جن کے دو نام بتائے گئے ہیں، ایک (مذبح یا قربان گاہ) اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر۔ مکہ معظمہ میں خانہ کعبہ بھی اسی قسم کا حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ہاتھ کا بنا ہوا خدا کا گھر ہے جس کے متعلق اسلام کا دعوے ہے کہ وہ دُنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر ہے۔

حضرت اسمٰعیل کی قربانی قرآن کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق وہ بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ تھے توراۃ اور قرآن دونوں سے ثابت ہوتا کہ ملت ابراہیمی کی بنیاد قربانی تھی اور یہی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ زندگی کی اصلی خصوصیت تھی۔ اور اسی آزمائش میں پورا اترنے پر ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی توراۃ میں ہے۔

"خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی ہے کہ میں

برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کناروں کے ریت کے مانند (لاتعداد) بڑھاؤں گا۔"

قرآن پاک میں ہے۔

(۱) "جب ابراہیمؑ کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا تو خدا نے اُس سے کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں"

(۲) "اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں"۔

یہی وہ برکت ہے جس کی مسلمان روزانہ پانچ بار خدا سے درخواست کرتے ہیں۔

اللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ	خدایا تو محمدؐ اور محمدؐ کی نسل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی نسل پر برکت نازل کی۔

لیکن یہ قربانی محض خون اور گوشت کی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی یہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں اور تمناؤں کی قربانی تھی۔

اسلام سراپا قربانی ہے

اسلام کے معنی ہی بندگی کے لیے گردن جھکا دینے کے ہیں، یہی حقیقت حضرت

ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کے اس ایثار و قربانی سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں اس کو اسلام کے لفظ سے ہی تعبیر کیا گیا۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ۔

جب ابراہیم واسمٰعیل اسلام لائے (یعنی حکم خدا کے آگے گردن جھکا دی) اور ابراہیم نے اُس کو (اسمٰعیل کو) پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔

غرض ابراہیمی ملت کی حقیقت ہی اسلام (اپنے ارادوں کو خدا کی مرضی پر قربان کر دینا) ہے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی؟ توراۃ نے اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا ہے، توراۃ کا عربی ترجمہ جو ۱۸۹۰ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے۔ اس میں اس مقام کا نام "مُرَیّا" لکھا ہے اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے اور یہ اُس مقام سے جہاں حضرت ابراہیم قیام پذیر تھے چند روز کی مسافت پر بھی کیونکہ حضرت ابراہیمؑ وموسیٰؑ کی شریعتوں کے مطابق قربان گاہ بیت اللہ ہونا چاہیے اور خاص کر اس لیے بھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہاں خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اس قربان کو ایسا معروف ہونا چاہیے کہ حضرت ابراہیم کا ساتھ کے نوکروں کو یہ کہنا درست ہو سکے "کہ میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں" یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی

جا سکیتں۔

مکہّ اور کعبہ اسلامی نقطہ نظر سے کعبہ وہ مقام ہے جو عرش الٰہی کا سایہ، خدائی برکتوں "سمت القدم" اور ازل سے دنیا میں خدا کا معبد ہے جسے سب بڑے بڑے پیغمبروں نے بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت قرار دیا، قرآن میں

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ۔ بیشک سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے،

لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا کی گمراہیوں نے اس کو بے نشان بنا دیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب چراغ توحید روشن کیا تو حکم ہوا اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے توحید کا پھریرا نصب کیا جائے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی کعبہ کا نام قرآن کے مطابق اَلْبَیْتُ الْعَتِیْقِ (پرانا گھر) تھا پس حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اس گھر کی پرانی بنیادیں تلاش کر کے نئے سرے سے اس کی چہار دیواری کھڑی کر دی قرآن میں ہے۔

اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ۔ جبکہ ابراہیمؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی ہوئی تھی۔

مکہّ اور کعبہ کی قدامت قدیم زبانوں کے محققین کے نزدیک مکہ بابلی یا کلدانی لفظ بمعنی "خانہ" ہے اس سے دو

باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ بکہ اس وقت سے آباد ہے جبکہ بابلی اور کلدانی قافلے ادھر سے گذرتے تھے دوسرے یہ کہ بکہ کی بستی خانہ کعبہ کے تعلق سے وجود میں آ کر بکہ کہلائی۔ مکہ کا نام بکہ سب سے پہلے زبور میں نظر آتا ہے۔ قدیم شامی زبان میں "بک" بمعنی شہر ہے جیسے بعلبک (بعل دیوتا کا شہر) شام کے ایک قدیم شہر کا نام ہے۔ یہ اس بستی کی قدامت کی دوسری دلیل ہے، قرآن نے بھی مکہ کو بکہ کے نام یاد کیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ

پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کیلئے بنایا گیا وہی ہے جو بکہ (یعنی مکہ) میں ہے۔

"کعبہ" کے لغوی معنی چو کھونٹے کے ہیں۔ بیت اللہ چوکھونٹا بنایا گیا تھا اور اب ایسا ہی ہے۔ یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ ملتا ہے۔ چنانچہ یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس ۶۰ قبل مسیح میں عرب کے ذکر میں کہتا ہے۔

"ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بڑی عزت کرتے ہیں"

ثمود، شام و حجاز کے حدود میں رہتے تھے اور سبا، یمن میں ظاہر ہے۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہ قابل عزت معبد خانہ کعبہ ہی ہو سکتا ہے۔

حج کی قدامت

رومیوں کی تاریخ میں پروگوپس مورخ لکھتا ہے کہ جب رومی سپہ سالار بلیزر نے اپنے فوجی افسروں

کو جمع کر کے مشورہ کیا تو شام کے دو افسروں نے کہا کہ آئندہ لڑائی میں وہ شریک نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سپہ سالار نے کہا۔

"تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں کیونکہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور ہتیار نہیں اُٹھاتے"۔

صاف ظاہر ہے کہ حج کے موسم کا بیان ہے۔

عرب جاہلیت کے اشعار میں بھی حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسمٰعیل اپنے موروثی مراسم اور خصوصیات کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھ کر اس پر لبیک کہا اور مکہ میں لا کر اس کے گلے پر چھری رکھی تو یہ ندائے غیبی سنی۔

" اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم نیک کام کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ---- اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو بچا لیا۔ اس وقت انہوں نے سمجھا کہ خواب کی تعبیر بیٹے کو توحید اور خانۂ خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دینا اور اس گھر مرکز خدا پرستی بنانا ہے جس کا مفصل ذکر سورہ بقرہ رکوع ۱۵۔۱۶، سورہ ابراہیم رکوع ۶ اور سورۂ آل عمران رکوع ۱۰ میں

ہے۔ ان آیات میں مفصل طور سے بتایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو جو ستارہ پرستوں سے بچکر ایک مامن کی تلاش میں تھے یہ ٹھکانا عنایت کیا جو ازل سے خدا کی توحید وعبادت کے لیے منتخب تھا، یہ مقام غیر آباد تھا اس لیے ابراہیمؑ نے دعا کی "اے خدا، میں یہاں اپنی اولاد کو بساتا ہوں ان کو روزی پہنچانا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل بنانا تاکہ وہ بت پرستی سے محفوظ رہ کر خالص عبادت بجا لائیں۔

قران کا دعوی ہے کہ اس مقام میں حضرت ابراہیم کی سی نشانیاں ہیں ان کے قیام ونماز کا مقام اور قربانی کی جگہ ہے۔ اس لیے لوگوں کو دُور دُور سے یہاں آکر دینی اور دنیاوی فائدے حاصل کرنے چاہئیں۔ خانہ کعبہ کا طواف کریں اور حضرت اسمٰعیل کی یادگار کے طور پر قربانی کر کے غربا کو کھلائیں۔ نہ کسی پر ہتیار اُٹھائیں اور نہ چیونٹی تک کو ماریں، آرام عیش اور تکلف کو چھوڑ کر یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہریں اور ابراہیمیؑ طریقہ پر خدا کی پرستش کریں۔

توراۃ کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ جہاں کوئی کرشمۂ خداوندی دیکھتے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور توحید کا معبد بنا لیا کرتے تھے، کعبہ کی بنیاد کی صورت بھی یہی ہُوئی نیز جو شخص خانۂ خدا کی خدمت وعبادت کے لیے کوئی نذر مانتا تھا تو نذر پوری ہونے کے بعد سر منڈواتا تھا۔ نیز توراۃ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو قربانی پسر کے لیے خدا نے پکارا تو انہوں

لَبَّیْکَ کہا جس کے معنی ہیں "میں حاضر ہوں" حاجیوں کے لیے یہی طریقہ مقرر ہوا کہ حج کے بعد سر منڈائیں قربانی کریں اور اٹھتے بیٹھتے لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صدائیں بلند کریں۔

حج کیا ہے؟

پس معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ رحمت خداوندی کے مہبط یعنی کعبہ میں حاضر ہو کر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی پیروی میں خدا کی جناب میں سر تسلیم کر دیا جائے اور انہی کے مانند عبودیت کا اظہار کر کے نوازشہائے ربانی سے سرفرازی حاصل کی جائے اسی لیے حاجی تمدن کے اس ابتدائی زمانہ کے مطابق بے سلے کپڑے (احرام) پہنتے ہیں، اقتدائے اسمٰعیل میں خدا کے حضور میں نذر (طواف) کرے اور اس کے بعد سر منڈاتے ہیں اور سامان تکلف عطر وغیرہ سے پرہیز، رنگین کپڑوں کا استعمال ترک اور سر ڈھانکنے سے گریز کرتے ہیں اور انہی دونوں بزرگوں کے مانند جو سفر کے گرد و غبار میں آئے ہوئے خانۂ خدا میں آئے تھے، حاجی بھی خدا کے گھر میں اسی حال میں پہنچتے ہیں اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی صدائے لَبَّیْکَ ان کی زبانوں پر ہوتی ہے صفا سے مروہ تک حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے تاکہ وہاں پہنچکر بیٹے کی قربانی کریں۔ اس کی یاد میں حاجی بھی دوڑتے (یعنی سعی کرتے) ہیں، اور عرفات میں جمع ہو کر اپنے عمر بھر کے گناہوں کی خدا سے معافی طلب کرتے ہیں اور عہد عبودیت و بندگی نئے سرے سے باندھتے ہیں اور یہی حج کا رکن اعلیٰ ہے یہ

احساس کہ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب سے پیغمبر اسی مقام پر اسی طرح ٹھہرے تھے مسلمانوں میں روحانی خاص کیف پیدا کر دیتا ہے۔ ارکان حج کی ادائیگی جو ایک قسم کی تذرہے اس سے فارغ ہو کر پیروی خلیلؑ میں کوئی جانور ذبح کر کے روحانی قربانی کی تمثیل پیش کرتے ہیں۔ اور اس وقت ان کی زبان انہی الفاظ کے ساتھ گویا ہوتی ہے جو اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے نکلے تھے، یعنی

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔	بیشک میں نے مُنہ اسکی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔	بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب جہانوں کے پالنے والے خدا کے لیے ہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، یہی مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے گردن جھکانے والا ہوں

اصلاحات

عبادات میں صرف حج ایک ایسا فریضہ تھا جس کے تمام اصول وارکان عرب میں زمانۂ جاہلیت میں بھی موجود تھے البتہ اُن کا محل استعمال تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور بعض مشرکانہ طریقے اس میں داخل کر لیے گئے تھے اس لیے اسلام نے ان کی حسب ذیل

اصلاحات کر کے حج کی فرضیت کا اعلان دوسری عبادات کی تدریجی فرضیت کے برخلاف یکبارگی کر دیا۔

(۱) عرب نے مناسک حج کو ذاتی نمائش کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ قیام منیٰ کو ذاتی اور آبائی مفاخرت کا ذریعہ بنا رکھا تھا اسلام نے تمام عبادات کی طرح اس کو بھی خدا کی یاد اور طلب مغفرت کا وسیلہ قرار دیا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی "جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خدا کا ذکر کرو۔

(۲) قربانی کے خون سے کعبہ دیواروں کو چھاپنا اور قربانی کے گوشت کو جلانا یکسر مٹا دیا اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی " خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا اس کے پاس تو صرف تمہارا تقوی پہنچتا ہے"۔

(۳) زاد راہ ساتھ لے کر چلنے کا حکم دیا تاکہ اہل یمن کی طرح مکہ پہنچکر بھیک مانگنے کی نوبت نہ آئے فرمایا "اور زاد راہ ساتھ لے کر چلو کیونکہ بہترین زاد راہ تقویٰ (سوال سے پرہیز) ہے۔

(۴) برہنہ ہو کر طواف کرنا جسے قریش نے اپنے امتیاز کی خاطر دوسرے قبایل کے لیے رائج کر رکھا تھا اسلام نے موقوف کر دیا اس کے لیے یہ آیت اُتری " ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو"، رسول اللہ نے اس کا اعلان ۹ھ میں حضرت ابوبکر کے ذریعہ کرایا۔

(۵) قریش کو جو دوسرے قبائل کے مقابلہ میں اپنا امتیاز قائم کرنے

کے لیے بجائے عرفات کے مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے حکم ہوا "کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں"

(۶) صفا اور مروہ کے درمیان دوڑ کر چلنا نہایت ضروری مذہبی سنت قرار دیدی گئی تھی اسلام نے اس کو زیادہ اہم نہایت قرار دیا۔

(۷) زمانہ جاہلیت میں حج کا ایک میلہ بن کر رہ گیا تھا، فسق و فجور اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ جو میلوں کی خصوصیت ہوتی ہے پائی جاتی تھی اسلام نے ان حرکتوں کو بند کر دیا یہ حکم نازل ہوا "جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کر لی تو اسن لو کہ) حج میں نہ شہوت دانی کی باتیں کرنا ہے اور نہ گناہ اور لڑائی فساد اور تم جو نیکی کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہوگی"

(۸) خاموش حج کی بدعت کو ختم کیا۔

(۹) پا پیادہ حج کرنے کی نذر کو کار ثواب سمجھنے کا جو خیال پیدا ہو گیا اس کو حضورؐ نے اپنی جان کو خود عذاب میں مبتلا کرنا قرار دیا اسی طرح عورتوں کو برہنہ سر اور برہنہ پا نذر ماننے کی مخالفت کی۔

(۱۰) حج سے واپسی کے بعد اپنی گھروں میں بجائے دروازوں کے پچھواڑے سے کود کر آنا کار ثواب سمجھا جانے لگا تھا، انصار ایسا کرتے تھے، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی "گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے نیک صرف وہ ہے جس نے پرہیزگاری کی اور گھروں میں انکے دروازوں سے داخل ہوا کرو"

(۱۱) اپنے آپ کو مجرم ٹھہراتے ہوئے بعض لوگ ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے حضورؐ نے ایک شخص کو اس صورت سے دیکھا تو نکیل کٹوادی اور فرمایا "اس شکنجے کو دور کرو یہ نذر نہیں ہے نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو"

(۱۲) زمانہ حج میں عمرہ نہ کرنا اور اس کے لیے سواریوں کی خستگی دور ہو جانے کا انتظار کرنا ایک بے معنی رسم قرار دے کر اس کو مٹا دیا۔

(۱۳) تجارت کو حج کے اور حج کو تجارت منافی سمجھ کر حاجی تجارت کے منافع سے اور تاجر حج کے ثواب سے محروم رہتے تھے اسلام نے یہ تفریق مٹا دی فرمایا

"تمھارے لیے یہ گناہ نہیں کہ (زمانۂ حج میں) خدا کے فضل (تجارت کے فائدہ) کی تلاش کرو"

ارکان حج پر تفصیلی نظر

احرام:۔ بے سلے کپڑے پہننا یہ گویا حج کے لیے ایسا ہے جیسے کہ نماز کے لیے تکبیر تحریمہ اس کے بعد انسان عام زندگی سے نکل کر نئی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ زیب وزینت، سلے ہوئے کپڑے، بی بی سے قربت، کسی جانور کا شکار کرنا وغیرہ سب حرام ہو جاتا ہے تمام لوگ بلا تفریق شاہ وگدا ایک طرح کے لباس میں ملبوس ہوتے ایک چادر کمر سے لپیٹ لیتے ہیں اور ایک سر کھلا چھوڑ کر گردن سے اس طرح لپیٹ لیتے ہیں کہ دایاں ہاتھ کام کرنے کے لیے کھلا رہے، یہ تمدن کے ابتدائی

دور کی سادہ یادگار اور عہد ابراہیمی کے لباس کا نمونہ ہے اور یہ گویا خدا کے دربار میں حاضری ہونے کے عجز و مسکنت آمیز وردی ہے۔

طواف:۔ عہد ابراہیمی میں قربان گاہ کے گرد پھر نذر ادا کی جاتی تھی۔ چونکہ حاجی اپنے آپ کو گویا قربان گاہ پر پیش کرتا ہے اس لیے خانۂ کعبہ کے چاروں طرف گردش کر کے دعائے مغفرت مانگتا ہے گویا یہ ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے اسی لیے حضور نے فرمایا "کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے مگر صرف یہ فرق ہے کہ اس میں تم بول سکتے ہو مگر نیک بات کے سوا نہ بولو۔"

حجر اسود کو چومنا:۔ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے بعد سے کئی بار ہوئی، ان کے عہد کا صرف ایک یہ کالا پتھر ہے جو کعبہ کی اس دیوار میں نصب ہے جو بیت المقدس کی سمت میں واقع ہے یہ طواف کے شروع اور ختم کا ایک نشان ہے ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ دیتے ہیں یہ بوسہ صرف اس محبت کا نشان ہے جو اس یادگار کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل کی روحانی اولاد یعنی مسلمانوں کو ہے، ورنہ اس پتھر میں اور کوئی کرامت کی بات نہیں اسی لیے حضرت عمرؓ نے اسکو بوسہ دیتے وقت فرمایا "اے سیاہ پتھر میں جانتا ہوں کہ تو صرف ایک معمولی پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، میں تجھے صرف اس لیے بوسہ دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تھا،"

صفا و مروہ کے درمیان سعی (دوڑنا)

کعبہ کے قریب ان ناموں کی دو پہاڑیاں تھیں اب ان کے کچھ کچھ نشان باقی رہ گئے ہیں۔ صفا بظاہر وہ پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے نو کروں کو چھوڑا تھا اور مروہ وہ پہاڑی ہے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی، بعض روایات کے مطابق ہاجرہ پانی کی تلاش میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑتی پھر رہی تھیں کہ زمزم کا چشمہ انہیں نظر آیا۔ حج میں ان کے درمیان سعی انہی کے حالت اضطراب میں دوڑنے کی یادگار ہے ان پہاڑیوں پر چڑھ کر اور اتر کر کعبہ کی طرف رخ کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ کیونکہ ان پر حضرت ابراہیمؑ و ہاجرہؑ کو خدا کے نشان نظر آئے تھے۔

عرفات میں ٹھہرنا:۔ اصل حج یہی ہے کہ نویں تاریخ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں زوال کے بعد سے غروب آفتاب تک ٹھہر کر خدا کی یاد کی جائے یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر امیر اسلام خطبہ دیتا ہے یہ وقوف ایک طرف شوکت اسلامی کا اور دوسری طرف روز حشر کے اجتماع کا نمونہ ہے اسی لیے سورۂ حج کی ابتدا میں حشر کا بیان قران میں آیا ہے، دنیا کے ہر خطہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کا یہ جم غفیر اور ان کی خدا کی حمد و دعا میں مصروفیت کا یہ نظارہ روح کو عجب تازگی بخشتا ہے۔

مزدلفہ کا قیام عرفات سے بعد مغرب روانگی کے بعد بوجہ دوری منیٰ مزدلفہ کو راحت و سکون حاصل کرنے کے لیے درمیانی منزل قرار دیا گیا، یہیں مشعر حرام نام کی مسجد ہے جو عبادت کے لیے خاص مقام ہے جس کے متعلق قرآن میں ہے۔

"جب تم عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو"

قیام منیٰ گو مقام قربانی مروہ تھا مگر مسلمانوں کی کثرت اور قربانیوں کے بیحد وحساب ہونے کی وجہ سے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کے مقام کو قربانی کے لیے مقرر کر دیا گیا دوسری وجہ یہ تھی کہ جاہلیت میں یہاں لوگ باپ دادوں پر فخر کی محفلیں جمایا کرتے تھے جن کا انجام بعض اوقات جنگ و جدل ہوتا تھا۔ اس رسم کے مٹانے کے لیے اس کو قربان گاہ اور خدا کی حمد و عبادت کا مقام بنا دینا بہترین طریقہ تھا، یہاں تین روز قیام کیا جاتا ہے، لوگ باہم ملتے جلتے اور قربانی اور دعوتیں کرتے ہیں۔

قربانی قربانی حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح کی یادگار ہے، منیٰ کے تین روز کے قیام میں مسلمان اس یادگار کو قومی عید بنا کر غربا اور فقرا کو کھانا کھلاتے ہیں جو قربانی کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دس دن کے روزے رکھ لے چنانچہ قرآن کا حکم ہے "جس کو قربانی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات واپس ہو کر۔

سرمنڈوانا نذر ماننے والے نذر سے فارغ ہو کر سر منڈایا کرتے تھے یہ اُسی پرانی رسم کی تعمیل ہے نیز اس پرانی رسم کے مطابق یہ غلامی کا نشان بھی تھا جبکہ آزاد کردہ غلام کے بال منڈوا دیے جاتے تھے گویا یہ خدا کی دائمی غلامی کا اقرار ہے۔

رمی جمار یعنی پتھروں پر کنکریاں مارنا میدان منیٰ میں پتھر کے تین ستون ہیں جن پر حضرت ابراہیمؑ کے اتباع میں کنکریاں مارتے ہیں۔ کیونکہ حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لیے لیجاتے وقت انہی تین جگہوں پر شیطان نے وسوسہ ڈالنا چاہا اور حضرت ابراہیمؑ نے اسکے کنکریاں ماری تھیں بعض کے نزدیک ابرہہ کی کعبہ پر فوج کشی کے وقت اس کی ہاتھیوں کی فوج کو کنکریوں سے ہلاک کیے جانے کی یادگار کے طور پر رمی جمار کی جاتی ہے۔ بہرحال یہ کنکریاں مارتے وقت خدا کی حمد کے ساتھ شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا کیجاتی ہے۔

رسوم حج کی غایت ان تمام رسوم کا مقصد عہد عتیق کی یادگاروں کو سامنے رکھ کر حج سے ماقبل وما بعد کی زندگیوں میں ربط دینا اور مستقبل کی اصلاح کرنا ہے اسی لیے حضور نے رمی جمار، سعی درمیان صفا ومروہ، اور طواف کا مقصد صرف یاد خدا کو قرار دیا ہے، قرآن نے بھی ادھر کا اشارہ کیا ہے فرمایا

"تاکہ ان مقررہ (حج کے) دنوں میں خدا کا نام یاد کریں"۔
اسی مقامات حج کو شعائر اللہ اور حرمات اللہ کے نام دیے گئے ہیں، فرمایا۔
(۱) "بیشک صفا اور مروہ شعائر اللہ (خاص مقام ذکر) ہیں"
(۲) جو اللہ کی حرمات (محترم چیزوں) کا ادب کرے گا تو یہ اس کے پروردگار کے نزدیک اس کے لیے بہتر ہے"۔

آداب حج احرام باندھ کر حاجی پر حسب ذیل آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) نیکی اور صلاح و تقویٰ۔
(۲) امن و آشتی۔
(۳) کسی کو ایذا نہ پہنچانا۔
(۴) شکار سے پرہیز۔
(۵) خاص طور سے راستوں میں لوٹ کھسوٹ اور ایذا رسانی سے احتراز اگر قصداً کسی جانور کو مار ڈالا تو اس کے کفارہ میں اسی کے برابر حلال جانور کی قربانی یا کھانا کھلانا یا روزہ رکھنا ہے۔

حج میں کیا مصالح ہیں خود قرآن نے نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی طرح حج کے فوائد و مصالح بھی خود ہی بتا دیے ہیں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ رکوع ۲۵ سورۂ حج رکوع ۴ اور سورۂ ابراہیم رکوع ۶ کی آیات سے حسب ذیل باتیں معلوم

ہوتی ہیں۔

۱۔ مرکز توحید یعنی خانہ کعبہ ملت ابراہیمی کا مسکن ہے۔

۲۔ یہاں حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے بسایا۔

۳۔ یہ وہ بابرکت مقام ہے جہاں گو کھیتی اور پیداوار نہیں مگر حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے قبول نے عالم کے دلوں کو اس کی طرف مائل بنا دیا۔

۴۔ خدا کے حکم مطابق حج کا اعلان عام کیا گیا تاکہ لوگ دین و دنیا کے فوائد حاصل کریں۔

۵۔ عازمین حج کے گناہوں مغفرت کے لیے حضرت ابراہیم نے دعا مانگی ہے۔

اصل مقصد تو مذکورہ بالا اوصاف رکھنے والے مقام میں دعا اور حصول برکت ہے۔ لیکن معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے یہ فوائد بھی پیش نظر ہیں۔

(۱) چونکہ حج کے لیے اہل و عیال کے نقطہ سے اسقدر رقم کا بچ رہنا شرط ہے جو مصارف حج کے لیے کافی ہو اس طرح اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریوں کا علم انسان کو خود بخود ہو جاتا ہے۔

(۲) مختلف ملکوں میں مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان اپنی عمومی اور اسلامی زبان عربی سے حج کے وسیلہ میں کچھ نہ کچھ آگاہ

ہو جاتے ہیں جس سے اسلامی عالمگیر اخوت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔
(۳) لباس احرام میں سب امیر و غریب، عالم و جاہل اور شاہ و گدا کی یک رنگی اور ایک خدا کے سامنے ایک میدان میں کھڑا ہو مساوات اسلامی کا دلکش نظارہ پیش کرتا ہے۔
(۴) چونکہ حج کے مصارف کے لیے مال حلال ضروری ہے اس لیے انسان کسب حلال کی طرف توجہ اور حلال و حرام میں تفریق کرنی پڑتی ہے جو بہت سی خوش اخلاقیوں کا سرچشمہ ہے۔
غرض حج میں مذہبی و دینی فوائد کے علاوہ اخلاقی، معاشرتی سیاسی اور قومی ہر لحاظ سے بے شمار منافع مضمر ہیں۔

سوالات

(۱) حج کا مفہوم، اور اس کی ابتدائی تاریخ پر پراز معلومات نوٹ لکھو۔
(۲) حضرت اسمٰعیل کی قربانی کے سلسلہ میں تم کیا جانتے ہو۔
(۳) مکہ اور کعبہ کی لغوی تحقیق کرو۔
(۴) دلائل شواہد سے ثابت کرو کہ حج ابراہیمی یادگار ہے
(۵) اسلام میں حج کی حقیقت کیا ہے۔ طواف، صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا، عرفات میں قیام کا مقصد و مطلب کیا ہے

(۶) اسلام نے حج میں کیا کیا اصلاحات کیں۔
(۷) رمی جمار سے تم کیا سمجھتے ہو اس کی حکمت و مصلحت پر روشنی ڈالو
(۸) حج میں معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے کیا فوائد مضمر ہیں۔

جہاد

قرآن میں ہے۔
وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ — اللہ کے راستہ میں پورا پورا جہاد کرو۔

جہاد کا مفہوم عام سے جہاد لڑائی کو سمجھا جاتا ہے مگر جہاد کا لفظ جہد سے بنا ہے جسکے معنی محنت و کوشش کے ہیں اس لیے جنگ و غزدہ کے علاوہ اس کے مفہوم میں ہر قسم کی جدوجہد، قربانی، ایثار اور جسمانی اور دماغی قوتوں کو راہ خدا میں صرف کرنا سب کچھ داخل ہے۔

یہ اسلام کے مخالفوں کا پروپیگنڈا ہے کہ انھوں نے جہاد کو صرف مخالفین اسلام کے ساتھ لڑائی لڑنے میں منحصر کر دیا ہے۔ چونکہ حضورؐ کی شریعت سراپا عمل ہے اس لیے نجات کا مدار ایمان کے بعد عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر رکھا گیا ہے، رہبانیت

گوشہ اور مراقبہ وغیرہ پر نہیں، غرض اسلام کی تبلیغ اور اس کی سربلندی کے لیے عبادات، معاملات اور مقاتلات میں ہر عملی جدو جہد جہاد ہے اسی لیے قرآن نے جہاد کے بالمقابل لفظ قعود رکھا ہے جس کے معنی بیٹھ رہنے کے ہیں اس تقابل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قران کی نظر میں جہاد کی حقیقت سستی اور آرام طلبی کے خلاف ہے۔ قران میں قتال اور جہاد کے الفاظ میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی قتال خاص ہے اور جہاد عام سورہ لنساء میں جہاد کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں — جہاد ۱ بالنفس یعنی حمایت حق کے لیے ہر طرح کی مصیبت کا مقابلہ کرنا حتی کہ جان جوکھوں میں ڈالنا اور جہاد ۲ بالمال یعنی حق کی سربلندی کے لیے اپنی دولت قربان کر دینا۔

جہاد کا نتیجہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم جہاد کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے مکہ میں تیرہ سال تک ہر قسم کا مقابلہ پامردی سے کیا اور قریش کی ہر طرح کی ایذا رسانی کو استقلال سے برداشت کیا، بھوک، پیاس، نیزہ اور تلوار اور ریگستان کی جلتی دھوپ اور پتھر کی بھاری سلوں کی تکلیف سے ان کے قدم راہ حق سے متزلزل نہ ہوئے، اسی طرح دس برس تلواروں کی چھاؤں میں بسر کیے قران نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مومن وہی ہیں جو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں کسی طرح کا شبہ دل میں نہیں لائے اور اپنی جان و مال سے

خدا کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ سچے ہیں"

جہاد کی کل قسمیں

جہاد بالنفس کے ماتحت اس کی ضمنوں قسموں کو بھی شمار کرنے سے جہاد کی پانچ قسمیں ہو جاتی ہیں۔

(۱) اپنے نفس کی خواہشات کا مقابلہ اسی کو جہاد اکبر کا لقب دیا گیا ہے حضورؐ نے میدان جنگ کے واپس آنے والے صحابہ سے فرمایا "تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، کیونکہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے خواہشات نفس سے لڑنا ہے۔

(۲) جہاد بالعلم اس کا مطلب یہ ہے کہ جہالت کے تمام شر و فساد کو علم کی اشاعت کر کے مٹانا عقل و دانش کی روشنی ہی وہ روشنی ہے جس سے دلوں میں سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیز تلوار کے زور سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرف قران نے رسول اللہؐ کو خطاب کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔

"تم لوگوں کو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور دانائی کی باتوں اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور اُن سے مباحثہ اور مناظرہ بھی اچھے ڈھنگ سے کرو"

اسی جہاد کو قران نے جہاد کبیر کا لقب دیا ہے، فرمایا۔

تم کافروں کا کہنا نہ مانو اور بذریعہ قران کے اُن سے بڑا جہاد کرو امام ابوبکر رازی نے احکام القران میں اسی کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال سے بھی بڑا قرار دیا ہے، حق کی نصرت اور دین کی حمایت

کے لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ علم حاصل کرے اور اس کو اسی کام میں صرف کرے۔

(۳) جہاد بالمال یعنی خدا کی بخشی ہوئی دولت کو اس کی راہ میں اور اس کی مرضی کے کاموں میں صرف کرنا۔ دنیا کے ہر کام میں روپیہ کی ضرورت ہے چنانچہ حق کی حفاظت و حمایت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے اس لیے جہاد بالمال کا درجہ بھی کچھ نہیں ہے حضور کی تعلیم کے اثر سے صحابہ نے بحالت ناداری میں جو مالی جہاد کیا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں موجود نہیں اسی لیے قرآن نے ان کا ذکر بڑی عظمت سے کیا ہے۔ فرمایا۔

"بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے جہاد کیا۔"

(۴) ہر کار خیر میں جان و مال اور دماغی قوتوں کا صرف کرنا اسلام کی نظر میں جہاد ہے چنانچہ عورتوں نے ایک دفعہ حضورؐ سے درخواست کی کہ ان کو غزوات میں شرکت کی اجازت دی جائے تو حضورؐ نے فرمایا۔ "تمھارا جہاد نیک حج ہے" اسی طرح ایک صحابی کو ماں باپ کی خدمت کی تلقین فرمائی اور اس کو جہاد قرار دیا، حق بات کے اظہار کو جہاد قرار دیا حضورؐ نے فرمایا۔

اِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الْجِهَادِ کَلِمَةَ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ	ایک بڑا جہاد کسی ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہدینا ہے۔

(۵) جہاد کی آخری حد اپنی جان کو راہ خدا میں قربان کر دینا ہے حق کے مخالفوں کی جان لینا یا اپنی جان دیدینا جہاد بالنفس کا آخری درجہ کمال ہے۔ اسی جہاد کا انعام خدا کی طرف سے بندہ کو حیات ابدی کی شکل میں عطا فرمایا گیا ہے ارشاد ہے۔

"خدا کی راہ میں جو لوگ مارے گئے ہیں اُن کو مُردہ نہ کہو بلکہ وُہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا احساس نہیں کرتے"

انہی جانثاروں کا لقب اصطلاح شریعت میں شہید ہے اور اس حیات ابدی کی طلب نے ہر مسلمان کو بیتاب بنا دیا ہے حتیٰ کہ خود حضور کی تمنا یہ بھی فرمایا "مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور پھر مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی خدا کی راہ میں قربان کر دوں اور پھر تیسرے زندگی ملے اور اس کو بھی نثار کر دوں"

یہ مرتبہ جہاد تو وہ مرتبہ ہے جس کا موقع ہر شخص نہیں ملتا باقی وہ جہاد جس کا موقع ہر شخص کو ہر وقت حاصل ہے وہ دین کی حمایت علم اشاعت، غریبوں کی امداد، عدل کا قیام، ظلم کے بیخ کنی اور احکام خداوندی اطاعت میں اس قدر انہماک حاصل کرتا ہے کہ انسان کا ہر حرکت و سکون ایک جہاد بن جائے۔

سوالات

(۱) جہاد کے مفہوم میں عام غلط فہمی کیا ہو گئی ہے اور اس کا صحیح

مفہوم کیا ہے۔

(۲) جہاد کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کا اسلام میں کیا مرتبہ ہے۔

(۳) شہید کا درجہ اسلام میں کیا ہے۔

(۴) وہ درجۂ جہاد کونسا ہے جس کو ہر مسلمان ہر جگہ اور ہر وقت حاصل کر سکتا ہے۔

قلبی عبادتیں

فقہا نے صرف جسمانی اور مالی عبادتوں سے بحث کی ہے، مگر صوفیہ کے ہاں ان کے علاوہ کچھ قلب کی عبادتیں بھی ہیں۔ اس طرح انھوں نے جسمانی اور مالی فریضوں کے ساتھ ان کو بھی شامل کر کے تمام فریضوں کو یکجا کر دیا ہے۔

ان میں سب سے زیادہ اہم تقویٰ، توکّل، صبر اور شکر ہیں۔ چونکہ ان چیزوں کا تعلق قلب سے ہے، اسی لیے ان کا نام قلبی عبادات رکھا گیا۔

تقویٰ | ہر اچھے اور بُرے کام میں خیر و شر کی خلش کا محسوس کرنا تقویٰ ہے۔ یہی سارے اسلامی احکام کی غرض و غایت ہے،

کیونکہ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد تقویٰ ہی ہے، اسی لیے قرآن کی تعلیم سے فائدہ اُٹھانے والوں کا وصف خاص تقویٰ قرار دیا گیا ہے، فرمایا۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ — یہ کتاب تقویٰ والوں کے لیے مشعل راہ ہے

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قربانی، تعمیر مسجد، حج کا زادِ سفر۔ عفوو درگذر، عدل وانصاف اور احسان ونیک کرداری غرض ہر عمل خیر کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔

برکات تقویٰ

(۱) تقویٰ جنت اور اُخروی نعمتوں کے استحقاق کا موجب ہے، فرمایا۔ (۱) "بے شک تقویٰ والے امن وامان کی جگہ میں ہوں گے (۲) بیشک تقویٰ والے جنتوں اور چشموں میں ہوں گے"

(۲) تقویٰ اُخروی کامیابی کا ذریعہ ہے، فرمایا "آخری انجام تقویٰ والوں کے حق میں ہے"

(۳) تقویٰ محبت الٰہی کا سبب ہے ارشاد ہے "تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں"

(۴) اہل تقویٰ کو اللہ کی معیت کا شرف حاصل ہے، فرمایا۔ "اور جان لو بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے"

(۵) تقویٰ اعمال کی مقبولیت کا موجب ہے ارشاد ہے "اللہ تو تقویٰ والوں سے ہی قبول فرماتا ہے"

اہل تقویٰ کی پہچان

متقی کون ہے اس کا جواب قرآن نے یہ دیا

ہے " اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا وہی لوگ تقویٰ والے ہیں"۔

یعنی وہ شخص جو اپنی زندگی کے ہر پہلو میں سچائی اور اخلاص رکھتا ہے، ذاتی غرض اور دنیوی عزِ و جاہ پر اُس کی نظر نہیں متقی کہلاتا ہے

اہلِ تقویٰ کے پورے اوصاف سورۂ بقرہ میں مذکور ہیں۔ یعنی خدا، فرشتوں، کتب آسمانی اور پیغمبروں پر ایمان لانا، یتیموں، مسکینوں مسافروں، سائلوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے مال صرف کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، وعدہ پورا کرنا، سختی اور تکلیف میں صبر کرنا ان اوصاف کے رکھنے والوں کو۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (یہی تقویٰ والے ہیں) کا خطاب دیا گیا ہے۔

تقویٰ کا مفہوم و حقیقت

تقویٰ کا اشتقاق وقایۃ سے ہے دراصل وَقویٰ تھا پہلی واؤ کو تاء سے تبدیل کر کے تقویٰ بنایا گیا، اس کے معنی بچنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں خیر و شر کا احساس پیدا کر کے برائیوں سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے یہ قلب کی صفت ہے۔ تقویٰ صرف سلبی (برائیوں سے بچنے کا) پہلو ہی اپنے اندر نہیں رکھتا بلکہ ایجابی (خیر کی طرف میلان کا) پہلو بھی اس میں ملحوظ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ	اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے
فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ	تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

یعنی شعائر خداوندی کا احترام جو ایک ثبوتی حقیقت ہے۔ دول کے تقوی سے متعلق ہے، اس آیت سے تقوی کا وصف دل ہوتا اور ایجابی پہلو کا حامل ہونا واضح ہے۔ تقوی مقابل فجور (بے حیائی) ہے اور ایک الہام فطری ہے، ارشاد ہے "ہر نفس میں اس کا فجور اور تقوی الہام کر دیا"، پس جس طرح فجور ہر گناہ کی اصل ہے اسی طرح تقویٰ ہر خیر کی بنیاد ہے۔

صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں باوجود قوت انتقام کے صحابہ کا اس صلح کو تسلیم کر لینا اور حمیۃ جاہلیۃ (جاہلانہ ضد) سے گریز کرنا بھی قرآن نے تقوی قرار دیا ہے اسی سلسلہ میں قرآن میں ہے۔

"اور انکو تقوی کی بات پر لگائے رکھا اور وہی انکے لائق اور اہل تھے"

تقوی برتری کا معیار ہے

اسلام میں خدا کے نزدیک برتری کا مستحق وہی ہے جو متقی ہے۔ رنگ روپ، نسل، وطن، پیشہ وغیرہ انسان کے ان خود ساختہ ذرائع شرف کا اسلام میں اعتبار نہیں اس کا اعلان قرآن نے ان الفاظ میں کیا۔

"ہم نے تمہیں مختلف خاندان اور قبیلے صرف اسلئے بنا دیا کہ باہم شناخت ہو سکے (ورنہ) تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے"

اسی کا اعلان حضورؐ نے حجۃ الوداع میں ان الفاظ سے فرمایا۔

"عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوے والا ہے۔

اخلاص

مذہبی اعمال و اخلاص کا تعلق دل سے ہے، دل ہی وہ آئینہ ہے جس کا صاف رکھنا مذہب کا فریضہ ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا۔

"ہوشیار رہو، بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست ہوتا ہے اور وہ بگڑ جائے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو! وہ دل ہے" انسان کے اعمال کا مطمح نظر بجائے دنیاوی اغراض اور ریاکاری کے خوشنودی خدا اور اس کے احکام کی اطاعت ہونی چاہیے، اسی کا نام اخلاص ہے۔ خدا نے حضورؐ کو حکم دیا "تو طاعت کو خدا کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کر" یعنی خدا کے سوا اطاعت گذاری میں کوئی دوسری چیز شریک نہ ہو، چنانچہ حضورؐ نے بامر خداوندی یہ اعلان فرمایا۔

"کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں طاعت کو خدا کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں"

تمام انبیا علیہم السلام نے اپنی تبلیغ و اشاعت دین میں دنیوی اجر و معاوضہ سے بیزاری اور خوشنودی خداوندی کی طلب کا اظہار کیا ہے چنانچہ

حضرت نوح کی زبانی قرآن میں منقول ہے "اے قوم! میں تم سے اس (تبلیغ دین) پر مال کا طلبگار نہیں میری مزدوری تو خدا پر ہے"

خود حضورؐ کو یہ حکم ہوا کہ اعلان کر دیں کہ "میں نے جو تم سے اجرت مانگی ہو تو وہ تمھارے لیے ہو میری اُجرت کو خدا کے ذمہ ہے"۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا "میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا"

اخلاص کامیابی کی بنیاد ہے

دنیا میں ہر کام کی کامیابی کی بنیاد اخلاص پر ہے اگر ذاتی غرض کا شائبہ کسی کام میں نمودار ہو جائے تو بڑے سے بڑے کام کی وقعت زائل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اخلاص پر اسقدر زور دیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کوئی عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق ومعاملات عبادت کی طرح مستحق اجر اور خیر و برکت ہوتے ہیں۔

آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کا قصہ قرآن میں مذکور ہے جنھوں قربانیاں پیش کیں مگر خدا کی بارگاہ میں صرف ایک کی قربانی مقبول ہوئی اور اس کی زبانی قرآن نے مقبولیت کی وجہ کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ — خدا تو متقیوں سے ہی قبول کرتا ہے۔

یہ تقوی بھی دل کے اخلاص کے ساتھ خدا کی خوشنودی کے لیے کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اہل تقوی اور با اخلاص لوگ ہی خدا کے

مقبول اور مخلوق میں محبوب ہوتے ہیں، وہی بامراد اور کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون نے جادوگروں کو کھڑا کیا مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ معجزہ موسیٰؑ کے سامنے ساحرانِ مصر کے کرتب افسانہ بن کر رہ گئے اور یہ حقیقت کہ۔

لَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی — اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔

دُنیا میں آشکارا ہوگئی۔

غرض عمل وہی عمل کہلانے کا مستحق ہیں جو اخلاص کے ساتھ کیا جائے اسی لیے اسلام نے ہر عبادت کے لیے نیت کی صحت پر زور دیا ہے۔

سوالات

(۱) تقوی کا مفہوم، اس کے برکات اور اہل تقوی کی پہچان پر جامع نوٹ لکھو۔

(۲) تقوی کے مفہوم میں صرف گناہوں سے پرہیز کا سلبی پہلو ہی پایا جاتا ہے یا تقوی ایجابی پہلو کا بھی حامل ہے، ثبوت و شاہد کے ساتھ جواب دو۔

(۳) ثابت کرو کہ اسلام میں تقوی ہی برتری کا معیار ہے۔

(۴) اخلاص عمل کے بارے میں تم کیا جانتے ہو۔

توکّل

توکّل کا مفہوم توکل کے معنی بھروسہ کرنے کے ہیں، اصطلاحاً خدا پر بھروسہ کرنے کو توکل کہتے ہیں۔ جھوٹے صوفیا کا ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا توکل نہیں بلکہ توکل خدا پر بھروسہ کرکے پورے عزم کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے۔

اگر توکل ترک دنیا اور ترک عمل کا نام ہوتا تو تبلیغ رسالت اور دین کے لیے جد وجہد کرنے کے لیے خدا پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا۔

توکل کامیابی کا راز ہے درحقیقت توکّل مسلمانوں کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ توکّل کے بارے میں حکم یہ ہے کہ جو اہم کام ہو اس میں مشورہ کرکے پھر پورے عزم کے ساتھ خدا پر بھروسہ کرکے اس کو کر گذرو اور نتیجہ اور انجام خدا کے سپرد کرو جو خدا کے فضل وکرم سے بہتر ہی ہوگا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ

اور کام میں اُن سے (صحابہ سے) مشورہ کرو پھر جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو اللہ خدا پر بھروسہ رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ توکل بے دست و پائی کا نام نہیں بلکہ پورے عزم سے انجام کو خدا کے سپرد کر کے عمل کرنے کا نام ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کو منافقین کی سازشوں سے بے پرواہ ہو کر خدا پر بھروسہ رکھنے اور سربلندی اسلام کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کا حکم دیا، خود حضور کو حکم ہوا۔

"تو ان منافقوں سے درگذر اور خدا پر بھروسہ رکھ، خدا ہی کام بنانے والا ہے"۔

توکّل کا نتیجہ بے خوفی ہے

خدا پر بھروسہ رکھنے والا دنیا کے بڑے سے بڑے خطرہ کو نظر میں لاتا اس توکل کا ہی نتیجہ تھا کہ حضور دشمنوں کے نرغہ کے باوجود مکّہ کی گلیوں میں راتوں کو مسلمان عبادت گذاروں کا حال دیکھتے پھرتے تھے۔

کفار اگر آمادہ بصلح ہوں تو اُن سے صلح کا حکم دیا گیا اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے کوئی دغدغہ دل میں نہ لانے کا ارشاد ہوا۔ فرمایا

"اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ۔۔ ۔۔۔ اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو کچھ پرواہ نہیں کیونکہ تجھے اللہ کافی ہے"!

یہود جیسی با اثر اور باثروت قوم کے مقابلہ میں بے خوف ہو کر تائید حق کے لیے مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے کا دیا گیا اور اسلام کی تبلیغ کی مشکلات میں خدا پر بھروسہ رکھنے کی ہدایت کی گئی چنانچہ اسی ذیل

میں حکم ہے۔

"تو اُس زندہ رہنے والے (خدا) پر بھروسہ رکھ جس کو موت نہیں آسکتی"

توکّل اور انبیاء سابقین حضورؐ سے پیشتر دیگر انبیاء علیہم کی زبانی بھی توکل کی عملی تعلیم کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

حضرت نوحؑ کے واقعہ میں قرآن کے اندر مذکور ہے کہ انہوں نے دشمنوں کے نرغہ میں طویل عرصہ تک پھنسے رہنے کے لیے یہ اعلان کیا۔

"(اے پیغمبر) ان کو نوح کا حال سنا جب اُس نے اپنی قوم سے کہا۔ اے میری قوم! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا وعظ کہنا تم پر شاق ہو تو (سن لو!) میں نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے، تم اپنی تدبیر اور شریکوں کو خوب مضبوط کر لو اور تم پر تمھاری تدبیر چھپی نہ رہے۔ پھر تم اس کو مجھ پر پورا کر دیکھو اور مجھے مہلت تک نہ دو"۔

حضرت نوحؑ کا یہ اولوالعزمانہ اعلان خدا پر انتہائی توکل نشان ہے۔ اسی طرح حضرت ہودؑ اپنی قوم کی دہشت انگیزیوں کے جواب میں فرماتے ہیں۔

"میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک بناتے ہو پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کر لو اور مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بھروسہ کر لیا ہے"

حضرت شعیبؑ خدا پر توکل کرکے اپنے قوم سے کہتے ہیں۔

"جب مجھ میں طاقت ہے میں اصلاح کرنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے۔ اُسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

خدا نے مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم کا نمونہ پیش کرکے توکل علی اللہ کی تلقین فرمائی ہے ارشاد ہے۔

"تمھارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں پیروی کا نمونہ ہے جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور اُن سے جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو بیزار ہیں ...... اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہمارا توکل ہے اور تیری طرف ہمارا رجوع اور لوٹنا ہے۔"

حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو مصر بھیجتے ہوئے ان کو شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی ہدایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"فیصلہ اللہ ہی کا ہے اسی پر میں نے توکل کیا اور اُسی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔"

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے بے پناہ لشکر وطاقت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی فرمایا۔

"اے قوم اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو تو اُسی پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو۔"

اسی توکل کا نتیجہ تھا کہ بنی اسرائیل کامران اور بامراد ہُوئے اور فرعون تباہ و ہلاک ہُوا، قرآن کی آیات سے توکل کی تعلیم ملتی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مشکلات میں خوف و ہراس سے بے پروا ہو کر اور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر عزم کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے اور نتیجہ خدا کے سپرد کرنا چاہیے ۔ حدیث میں ہے کہ ایک بدوی نے حضور سے پوچھا کہ میں اپنے اونٹ کو یونہی چھوڑ دوں اور خدا پر بھروسہ کروں یا اُس کو باندھ کر، حضورؐ نے فرمایا "اس کو باندھ کر خدا پر بھروسہ کرو"

تعویذ گنڈا اور جھاڑ پھونک پر بعض لوگ اعتماد رکھتے ہُوئے اس کو توکل علی اللہ کا درجہ دیتے ہیں ۔ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگوں کا ایسا عقیدہ تھا کہ لیکن حضورؐ نے یہ فرما کر اس کی تردید کر دی ور کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص بے حساب کتاب جنت میں داخل ہونگے اور یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے ---- اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔ دوسری حدیث میں فرمایا "جو داغ لگواتا ہے اور تعویذ گنڈا کرتا ہے وہ توکل سے محروم ہے"

ایک موقعہ پر حضورؐ نے فرمایا " اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تم ایسے ہی روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو کہ وہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں ۔ اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں" اس حدیث سے بھی اشارہ اسی طرف ہے ۔ توکل ترک تدبیر کا نام نہیں کیونکہ

طلب رزق میں پرندوں کا نکلنا بیان فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ گھونسلے میں بیٹھے ہوئے اُن کو روزی پہنچنے کا وعدہ ہو۔

توکل گناہوں سے روکتا ہے

اللہ کا وعدہ ہے کہ "زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں۔ لیکن اُس کی روزی خدا کے ذمہ ہے" اگر اس پر انسان کو پورا بھروسہ ہو تو وہ چوری، ڈاکہ، خیانت اور قتل وغارت کا ہرگز مرتکب نہ ہوگا اور نہ اس کو کسی قسم و تنگی اور مایوسی لاحق ہوگی۔

سوالات

(۱) توکل کسے کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں عوام وخواص کا تخیل کیا ہے۔

(۲) ثابت کرو کہ توکل میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

(۳) توکل اور انبیائے سابقین اس عنوان کے ماتحت اپنے معلومات کا جامع خلاصہ قلمبند کرو۔

(۴) جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا کرانے کو لوگ خدا پر توکل کرنا سمجھتے ہیں۔ حضورؐ کے اقوال حکیمانہ کے پیش نظر اس خیال کا کیا درجہ ہے۔

صبر

صبر کا مفہوم صبر کے معنی روکنے اور برداشت کرنے کے ہیں، عوام کی غلطی سے صبر کو بے کسی اور بے چارگی کی ایک شکل تصور کیا جاتا ہے لیکن واقعہ اسکے خلاف ہے، صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مصیبت کے وقت گھبراہٹ سے بچنا اور اپنی جگہ پر ثابت قدم رہنا چاہیے، پس صبر پامردی، بلند حوصلگی، اخلاقی جرأت اور ثابت قدمی کا نام ہے، نہ کہ بے چارگی اور بے بسی کا۔

حضرت موسیٰ اور خضر کے قصہ میں تین جگہ صبر کا ذکر آیا ہے اور اُس سے مراد لاعلمی کی صورت میں غیر متوقع امور کے پیش آجانے پر مضطرب اور بے چین نہ ہونا مراد ہے۔

عرب بدو حضورؐ کے حجرہ کے پاس آکر بدتمیزی سے حضور کو پکارنے لگتے تھے۔ قرآن کی آیت نے نازل ہو کر بتایا کہ ان کو اس گھبراہٹ کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا صبر کرتے۔ فرمایا۔

"اگر یہ ذرا صبر کرتے یہاں تک تم (اے رسول!) نکل کر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا"۔

اگرچہ حالات کی تبدیلی سے صبر کے مفہوم میں بھی کچھ کچھ تغیر پیدا

ہوگیا ہے مگر سب کا ماحصل ایک ہی ہے یعنی ثابت قدمی اور استقامت قرآن میں صبر کے حسب ذیل مختلف محل استعمال ہیں۔

مناسب وقت و محل کا انتظار ابتدا میں حضورؐ کو تبلیغ اسلام میں کفار کی ایذا رسانی اور رکاوٹوں کچھ بے چینی لاحق ہونے کا اندیشہ ہوا تو قرآن نے ان کو تشفی دی اور کفار پر کامیابی حاصل کرنے کے لیے مناسب وقت تک صبر کیے رکھنے کی تلقین کی۔ ارشاد ہوا۔

(۱) "اے رسول! تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے"۔

(۲) "اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے"

(۳) "ثابت قدمی سے منتظر رہ بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے"

اسی ذیل میں حضرت یونسؑ کا قصہ حضورؐ کو سنایا جو خدائی عذاب کے حسب وعید سرکش قوم پر نازل ہونے کی وجہ سے قوم سے روپوش ہو گئے تھے، حالانکہ عذاب اس وجہ سے ٹل گیا کہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور سے ارشاد خداوندی ہوا کہ تم اس طرح رشتہ صبر نہ چھوڑ دینا فرمایا۔

"اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کر اور مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو جانا"۔

(۲) مضطرب نہ ہونا | مصیبت کے وقت بے قرار نہ ہونا بلکہ اس کو مشیت ایزدی سمجھ کر برداشت کرنا صبر کا دوسرا مفہوم ہے۔ خدا نے ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔

وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ — اور جو صبر کرنے والے ہیں اس مصیبت پر جو انہیں پیش آئی۔

حضرت یعقوبؑ کو جب اخوان یوسف نے خبر دی کہ ان کو بھیڑیے نے پھاڑ ڈالا ہے تو فرمایا۔

"بلکہ تمھارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے تو بہتر صبر ہے"۔

اس کے بعد دوسرے بیٹے بن یامین کے مصر میں روک لیے جانے کی خبر سن کر یہی الفاظ پھر فرماتے ہیں۔

حضرت ایوبؑ نے جسمانی مصیبتوں پر صبر کیا تو خدا نے ان الفاظ میں ان کی مدح فرمائی "بے شک ہم نے ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ! وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا!"

(۳) راہ حق میں بے خطر ہونا | راہ حق میں مخالفین کی ایذیتوں اور طعن و طنز کو خاطر میں نہ لانا پامردی سے ان کے مقابلہ پر جمے رہنا یہ صبر کا تیسرا مفہوم ہے۔ اسی لیے حضورؐ کو تبلیغ دین کے ساتھ صبر کی بھی تلقین فرمائی گئی ارشاد ہوا

"اے کملی پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہوشیار کر ـ ـ ـ ـ ـ اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی سے ڈٹا رہ (فاصبر)"

حضرت لقمان نے بیٹے کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ (امر بالمعروف میں) جو مصیبت تجھے پیش آئے اس پر صبر کر۔

(۴) معاف و در گذر کرنا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ بدوں کی ایذا رسانی کو برداشت اور ان کی خطا کو معاف کیا جائے۔ خدا کا ارشاد ہے۔

فَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی ہے اور اگر صبر (معاف) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے

یہ صبر اور در گذر محض خدا کی خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے، خوف یا کمزوری کی بنا پر نہیں اسی لیے ایک دوسری آیت میں بتا دیا گیا کہ برائی کا بدلہ نیکی سے دینے کی توفیق صاحب صبر و ضبط شخص کو ہوتی ہے ارشاد ہے۔

"بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، برائی کو اچھائی سے دور کرو تو یکبارگی وہ شخص جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی ہے وہ قریبی دوست بن جائیگا اور یہ بات انہی کو میسر ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے"

(۵) لڑائی میں ثابت قدم رہنا میدان جنگ بہادرانہ استقامت صبر کا پانچواں مفہوم ہے۔ خدا نے ایسے لوگوں کو صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

اور صبر کرنے والے مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت یہی ہیں وہ لوگ جو سچ بولے اور وہی پرہیزگار ہیں۔

صبر موجب غلبہ ہے میدان کارزار میں مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی قلت تعداد سے نہ گھبرائیں اگر بیس[۲۰] صبر کے ساتھ ڈٹنے والے ہوں گے تو وہ دو سو[۲] پر غالب آئیں گے سو[۱] ہوں گے تو ہزار کافروں پر بھاری ہوں گے پھر بعد میں مسلمانوں کی کمزوری کے پیش نظر صبر کرنے والوں کو اپنے سے دوگنی تعداد پر غالب ٹھہرایا۔ قصہ طالوت و جالوت میں یہی چیز بیان کی گئی ہے کہ بارہا چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔ اس لیے کفار اور دشمنوں کی بڑی تعداد دیکھ کر پائے صبر کو ڈگمگانے دینا نہیں چاہیے۔ بنی اسرائیل کو جب فرعون کے پنجۂ استبداد سے رہائی پانے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جو تعداد میں بہت زیادہ تھے مقابلہ کرنا پڑا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو یہ تلقین کی۔

"موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر و استقامت سے کام لو"

اس تلقین پر عمل کرنے سے بنی اسرائیل کی تمام مشکلات رفع ہوگئیں۔ اور وہ بالآخر خود مختار سلطنت پر قابض ہوگئے اور دوسری قوموں پر حکمران رہے۔

غزوہ احد کی شکست میں جب مسلمانوں میں افسردگی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالٰے ان کو پچھلے پیغمبروں کی روئداد زندگی سنا کر تلقین صبر فرماتا ہے "اور کتنے ہی پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طلبگار لڑے پھر خدا کی راہ تکلیف اُٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہُوے اور اللہ صبر کرنے والوں کو درست رکھتا ہے"

اس آیت سے یہ حقیقت اشکارا ہو جاتی ہے کہ صبر بے لبسی کا نام نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت اور بلند ہمتی کا نام ہے۔

دنیوی و اُخروی فلاح صابرین کے لیے ہے

جس طرح دنیوی کامرانیاں صبر پر مرتب ہوتی ہیں اسی طرح اُخروی کامرانی جس کا نام حصول جنت ہے، اہل صبر کے لیے ہی ہے۔

چنانچہ فرمایا۔

"کیا تم نے خیال کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں"

(۶) خواہشات نفس پر قابو رکھنا

کامیابی یا ناکامی وقت اپنے نفس پر قابو رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر شخصی اور قومی سنجیدگی اور متانت کے اظہار کا وقت بھی یہی ہوتا ہے دنیا میں رنج اور راحت دونوں ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ضبط نفس یہ ہے کہ رنج میں مایوس و افسردہ نہ ہو اور راحت و خوشی میں فخر و غرور

کا نشہ سوار نہ ہو خدا نے انسانی فطرت کی اسی کمزوری کو ظاہر فرما کر اس کا علاج صبر و ضبط نفس کو قرار دیا ہے ارشاد ہے۔

"اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی عنایت کا مزہ چکھائیں اور اس سے چھین لیں تو وہ مایوس اور ناشکرگذار بن جاتا ہے اور اگر مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہنے لگتا ہے کہ (اب) برائیاں مجھ سے دور ہوئیں اور شادمان اور نازاں ہو جاتا ہے لیکن وہ لوگ جنھوں صبر و ضبط نفس سے کام لیا اور اچھے کام کیے، ان کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے"۔

مشکلات میں فرض مذہبی کو نہ بھولنا

صبر کی ایک صورت یہ ہے کہ مذہبی فرائض و احکام کو مصائب کی شکل میں ادا کیا جائے اور عبودیت پر ثابت قدم رہا جائے حضورؐ کو حکم ہوا۔

"تو اس کی بندگی کر اور اس کی عبادت پر صبر کیے رکھ (یعنی ثابت قدم رہ) دوسری جگہ حکم ہے"۔

"اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود بھی اس پر قائم رہ (صبر کر)"

جزائے صبر

اہل صبر کے لیے قرآن نے یہ بشارت دی ہے۔

اُولٰٓئِکَ یُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَۃَ بِمَا صَبَرُوۡا

ان کو بہشت کا جھروکہ اس کے بدلے میں ملے گا کہ انہوں نے صبر کیا۔

غرض نیک کاموں کو باوجود خلاف طبع ہونے کے برابر کرتے رہنا اور بُری باتوں سے باوجود خوشگوار معلوم ہونے کے برابر بچتے رہنا تکلیف و شفقت کے باوجود خطرناک مقامات میں راست گوئی اور راست کرداری سے باز نہ آنا اور مصائب کو برداشت کرنا اور عمر بھر احکام خداوندی کو پائیداری سے بجالانا اگرچہ یہ صبر کی کٹھن منزل ہے مگر اس کا اجر بھی خدا کے ہاں عظیم الشان ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا۔

"جنت (نفس کی) ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے گھری ہے"۔

انعام صبر کے یقینی ہونے کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

(۱) "اور ثابت قدمی سے رکیے جا کیونکہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا"

(۲) بے شک صبر کرنے والوں کو بے حساب ان کا اجر دیا جائے گا۔

صبر وسیلہ ظفر ہے

اسلام نے مصائب و دشواریوں کے حل کا طریقہ صبر اور دعا تجویز کیا ہے یہود جو سخت دلی اور جذبہ قربانی نہ ہونے کی وجہ سے اسلام سے کتراتے تھے قرآن نے ان کی بیماری کا علاج اسی کو تجویز کیا فرمایا۔

"صبر اور دعا (نماز) سے مدد لو"

ہجرت کے بعد قریش مسلمانوں سے آمادہ بیکار ہوئے تو مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی "اے مومنو! صبر اور دعا سے مدد لو، بیشک اللہ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو اللہ کے راستہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے اور ہم کسی قدر خوف، بھوک اور مال وجان اور پیداوار کے نقصان سے تمھاری آزمائش کریں گے، لبشارت دے دو۔ ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں" ان کے اوپر ان کے رب کی طرف سے رحمتیں اور مہربانیاں ہیں اور وہی ٹھیک راستہ پر ہیں"

سوالات

(۱) صبر و استقامت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم لکھ کر بتاؤ کہ صبر کے مواقع کون سے ہیں اور ان کے لحاظ اس کے مفہوم میں کیا کیا تبدیلی ہوتی ہے۔

(۲) صبر موجب غلبہ ونصرت ہے ان نظریہ کی وضاحت شواہد کی روشنی میں کرو۔

(۳) ضبط نفس سے کیا مراد ہے۔

(۴) صبر کا اجر ضرور ملے گا اس سلسلہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامی قران میں کیا ہیں۔

شکر گذاری

شکر کا مفہوم

شُکر کے لغوی معنی جانور کا کم چارہ کھا کر پورا دودھ دینا ہیں۔ انسانی اصطلاح میں اس کے معنی کسی کے تھوڑے کام کو بہت مان کر اس کا احسان مند ہونا اور اس کی قدر کرنا، قدر کرنے کے تین طریقے ہیں۔ دل[۱] سے اس کی عظمت کا اعتراف زبان[۲] سے اس کی ثنا اور اعضائے بدن[۳] سے اس کی اطاعت و خدمت

شکر کی ضد کُفر ہے جس کے لغوی معنی چھپانے کے نہیں، کافر یعنی ناشکر گذار محسن کے احسان کو چھپاتا ہے اور اس کی قدر نہیں کرتا۔ اسلام میں کُفر سے بڑھ کر بُرا لفظ اور کوئی نہیں پس شکر جو اس کا بالمقابل ہے وہ سب سے بڑھ کر اچھا ہوگا قران نے بھی ان کو ایک دوسرے بالمقابل استعمال کیا ارشاد ہے۔

(۱) "ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا اب وہ شاکر (شکر گذار ہو) یا کفور (ناشکرا)"

(۲) "اگر تم شکر کرو گے تو ہم تمہیں بڑھائیں گے اور اگر کفر (ناشکری) کرو گے تو بیشک میرا عذاب بڑا سخت ہے۔"

خدا کے احسانات کی ناقدری کفر اور ناشکر گزاری ہے اس کے مقابلہ میں شکر یہ ہے۔ کہ خدا کی نعمتوں کی قدر پہچان کر اس کے احکام

کی بجان و دل اطاعت کی جائے اسی لیے اللہ تعالے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا۔

"بے شک ابراہیمؑ دین کی راہ قائم کرنے والا اور اللہ کا فرمانبردار تھا۔ وہ مشرکین میں سے نہ تھا، اللہ کی نعمتوں کا شکر گذار تھا (اسی لیے) اللہ نے اس کو برگزیدہ کیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شکر گذاری اور شرکت سے بچنا خدا کے نزدیک مقبولیت کا ذریعہ ہے۔

شکر ایمان کی اصل ہے اور خدا بندوں سے صرف انہی دو باتوں کا خواستگار ہے۔ اگر دونوں ہیں تو اللہ کو بندوں کو عذاب دینے سے کیا مطلب فرمایا۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۔

اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

ناشکر گذاری نافرمانی اور کفر کی جڑ ہے اسی لیے شیطان نے خدا سے جب یہ کہا کہ تیرے بندوں کو نافرمان بنا دوں گا تو یہ کہا تھا۔

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ۔

اور ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

شکر گذاری کا تعلق جب زبان سے ہو تو اس کا نام اصطلاح قران

میں حمد ہے، اسی لیے حمد خداوندی کے سلسلہ میں اُن کامل صفات الٰہی کا ذکر ہے۔ جو احسانوں اور نعمتوں کی محرک اول ہیں اور اسی لیے قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے، جو تمام قرآن کا خلاصہ اور حمد کا اصل الاصول ہے، کیا گیا۔ خدا کی حمد کا ترانہ دنیا کا ذرہ ذرہ گا رہا ہے ارشاد ہے۔

لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اُسی کی حمد آسمانوں میں اور زمین پر ہے۔

فرشتے حمد میں مصروف ہیں، فرمایا "جو (فرشتے) عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اور جو (فرشتے) اُس کے گرد ہیں وہ اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرتے ہیں"۔

اسی حمد و شکر کا مطالبہ انسان سے ہے، فرمایا "اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر"، حضورؐ سے جو کثرت سے دعائیں کھانے، پینے، پہننے، سوئے، جاگنے، نئے پھل کھانے، مسجد میں جانے، نکلنے اور اسی طرح طہارت خانہ میں جانے اور نکلنے وغیرہ کے بارے میں مروی ہیں وہ سب خدا کی نعمتوں کے شکرانہ ادا کرنے کیلئے ہیں

قرآن میں کہیں خدا کی قدرت و حکمت کی نعمتوں پر شکر بجالانے کی ہدایت کی گئی، تو کہیں خود انسان کی خلقت جسمانی کا بیان کر کے شکر کرنے کی دعوت دی گئی۔

دنیا میں بندوں کے ساتھ ادائے شکر کا طریقہ ایک یہ بھی کہ محسن کے احسان کے برابر اُسکے ساتھ بھی احسان کیا جائے۔ لیکن چونکہ خود

خدائے تعالیٰ کو اس قسم کے شکریہ کی حاجت نہیں اس لیے اس کی صورت خدا کے احسان کے بارے میں یہ ہے کہ اس قسم کا احسان خدا کے دوسرے بندوں کے ساتھ کیا جائے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ — اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا تو بھی احسان کر

اسی کو قرآن نے کہیں قرضہ دینے کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا۔

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا — کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے

وجوب شکریہ کا سبب خدا نے بار بار شکر کا مطالبہ اس وجہ سے بھی کیا ہے کہ ہم کہیں ان نعمتوں کو اپنا حق واجب نہ سمجھنے لگیں حالانکہ وہ صرف خدا کی طرف سے ہمارے استحقاق کے بغیر عطیہ و بخشش ہیں۔

نیز اس وجہ سے بھی شکر کا مطالبہ کیا گیا کہ نعمت پانے والا انسان اپنے لیے دوسروں پر فوقیت اور برتری نہ سمجھے اور ان کو اپنے کسب اور علم و ہنر کا نتیجہ قرار نہ دے جیسا کہ قارون نے کیا تھا کیونکہ یہی غرور ترقی کر کے بخل اور ظلم کی حد تک پہنچ جاتا ہے اس لیے ارشاد ہوا۔

"اور جو تم کو خدا نے دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں، اللہ کسی اترانے

والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا جو خود بخیل ہیں اور لوگوں کو بخیل بننے کی تلقین کرتے ہیں اور جو (اللہ سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو اس کی پرواہ نہیں) اللہ تو غنی اور خوبیوں والا ہے۔ خدا نے بیشمار نعمتیں انسان کو مرحمت فرمائی ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ انسان اپنے محسن کی قدر پہچانے اور اس کی نعمتوں کا شکریہ جان و مال سے اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ادا کرے، فرمایا۔

وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔	اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی کیں تاکہ تم شکر ادا کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

"اللہ نے اپنی رحمت سے تمھارے لیے رات اور دن کو بنایا تاکہ اس میں (رات میں) سکون حاصل کرو اور (دن میں) اس کے فضل وکرم کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو"

لیکن مقام افسوس ہے کہ خدا کی اتنی نعمتوں اور شکر کی اتنی ہدایتوں کے باوجود اکثر لوگ اس سے غافل ہیں خود قرآن ان کا شاکی ہے ارشاد ہے۔

"اللہ نے تو انسان پر بڑے بڑے فضل کیے ہیں لیکن ان میں سے اکثر شکر ادا نہیں کرتے"

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

"ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی اور اس میں تمہارے لیے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ناشکری پر ایک جگہ محبت آمیز غصہ کا بھی اظہار فرمایا گیا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ — مارا جائے! یہ انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے

حقیقت شکر عموماً لفظی طور پر الحمد للہ کہہ لینے کو لوگ ادائے شکر سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں، حقیقتاً شکر وہ ہے جو دل کے لطیف احساس منت پذیری کے ماتحت محسن کی عظمت و جلال کو دل میں جگہ دے کر ادا کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو تو محض زبان سے شکر ادا کرنا ایک لفظ بے معنی ہے۔ جو بارگاہ خداوندی میں مقبول نہیں۔ اسی وجہ سے آل داؤد سے خدا نے اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرا کر عملی شکر کا مطالبہ کیا ہے۔ فرمایا۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ — اے داؤد کے گھر والو شکر ادا کرنے کے لیے نیک عمل کرو اور میرے بندوں میں سے شکر گذار تھوڑے ہیں۔

اور اسی لیے حضرت سلیمان خدا سے اس توفیق کے طلبگار ہیں۔

"اے رب! مجھے نصیب کر کہ میں ترے احسان کا جو تو نے مجھ پر کیے اور میرے ماں باپ پر کیا ہے شکر ادا کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو"

شکر مزید نعمت کا سبب ہے بندہ جسقدر شکر گذاری میں صدق نیت

اور صدق عمل سے سرگرم ہوگا اُسی قدر خدا کی طرف سے نعمتوں کی فراوانی ہوتی جائے گی، فرمایا۔

"اگر تم شکر گذاری کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے"

حضورؐ نے باہمی انسانوں میں ایک دوسرے کے احسان کی شکرگذاری کو خدا کی شکر گذاری کا معیار قرار دیا ہے ارشاد ہے

مَنْ لَا یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ۔ جو انسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا۔ وُہ خُدا کا بھی شکریہ ادا نہ کرے گا

سوالات

(۱) شکر کا مفہوم لغوی اور اصطلاحی لحاظ سے قلمبند کرو۔

(۲) ثابت کرو کہ شکر ایمان اور ناشکری کفر کی جڑ ہے۔

(۳) شکر کا تعلق کن تین چیزوں سے ہے۔

(۴) شکر کے واجب و لازم ہونے کی وجہ کیا ہے۔

(۵) حقیقی شکر کونسا ہے جو درگاہ خداوندی میں مقبول ہے۔

تمت بالخیر

مجبوب الٰہی
جامعہ شرقیہ لاہور

اورینٹل فنکاٹسٹی کی تمام کتب

بارعایت

ملنے کا پتہ

ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بک ڈپو

اردو بازار لاہور